

خطاطی

۱۰۷

ہمارا رسم الخط

تلم

سید یوسف بخاری



خطاطی

اور

ہمارا رسم الخط



قلم

سید یوسف بخاری، دہلوی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

136366

نقش اول : مئی ۱۹۵۹ء مطابق شوال ۱۳۷۸ھ

ناشر : ایچ، ایم، سعید کمپنی، ناشران و تاجران کتب
پاکستان چوک، کراچی

طابع : ایجوکیشنل پریس، پاکستان چوک کراچی

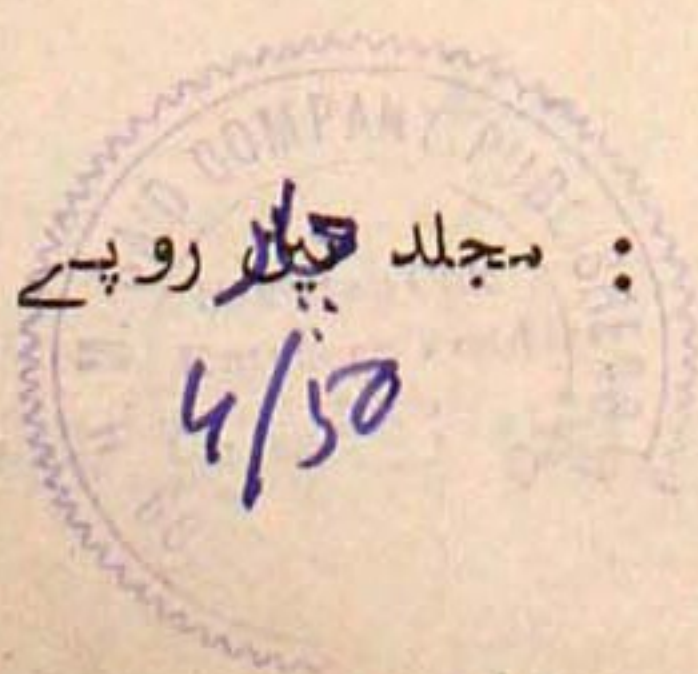
مہتمم طباعت : محمد یعقوب، لکھنوی

حرف پرداز : (Compositor) مسلم اختر، (علیگ)

رسم الخط : آرد و نستعلیق ٹائپ

صفحات : ۲۱۳ : تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : مجلد چار روپے ۸ آنے - بلا جلد تین روپے -



ماخذ

- ۱ - فرهنگ آصفیہ : خانصاحب منشی سید احمد، دہلوی
- ۲ - محاکمہ آردو : ایضاً
- ۳ - علم الحروف یا تحقیقات ماہر : حکیم محمود علی خان،
ماہر، دہلوی
- ۴ - اصطلاحات پیشہ وراں، جلد چہارم : مولوی ظفر الرحمان،
دہلوی، مطبوعہ انجمن ترقی آردو ہند، دہلی
- ۵ - خطبات اور مقالات گارساں دتاسی : مطبوعہ انجمن ترقی
آردو، ہند، دہلی
- ۶ - فن صحافت : مولوی رحم علی الہاشمی :
مطبوعہ انجمن ترقی آردو ہند، دہلی
- ۷ - افادی ادب : پروفیسر محمد اختر انصاری، علیگ
- ۸ - آئین اکبری : دارالترجمہ حیدرآباد، دکن
- ۹ - مضامین شرر : مولوی عبدالعلیم، شرر، لکھنوی
- ۱۰ - میری کہانی : پنڈت جواہر لعل نہرو
- ۱۱ - کمپنی کی حکومت : عبد الباری
- ۱۲ - دستور حکومت پاکستان
- ۱۳ - رپورٹ مردم شماری حکومت پاکستان، بابت ۱۹۵۱ء
- ۱۴ - رسائل و اخبارات : رسالہ آردو، جولائی، اکتوبر ۱۹۵۸ء
قومی زبان، قومی آواز، انجمن ترقی آردو ہند و پاک،
نقوش لاہور، جنگ کراچی، منشور دہلی، تیج دہلی -

نقوش

- ۱ - فرمان مقدس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ،
بنام سلطان مقوقس والی مصر
- ۲ - ورق قرآن مجید ، نوشتہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر
- ۳ - سرورق ، منبہات : احمد بن محمد الحجی . ۱۱۰ھ
(اس کتاب کے دنیا میں صرف تین قلمی نسخے موجود ہیں)
- ۴ - وصلی داراشکوہ
- ۵ - وصلی سیر عماد ، عہد شاہ جہانی
- ۶ - ورق قرآن مجید ، عبدالباقی حداد ، یاقوت رقم اول
- ۷ - ورق قرآن مجید : قلم سید حامد بخاری ابن سید محمد شاہی
امام جامع مسجد ، دہلی (۱۳۱۶ھ)
- ۸ - ریشمی یافت میں خطاطی کا کمال
- ۹ - شجرہ خطوط : مرتبہ مصنف

انتساب

== فاخذ ايان خط كے فام ==



بالمدينة

منه في سنة ١٢٠٠

حرف ناشر

یوسف بخاری صاحب، دہلوی کی شخصیت، ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، خاندانی اعتبار سے بھی وہ خاندان آئمہ جامع مسجد دہلی کے ایک ہونہار فرزند ہیں۔ ادبی خدمات کے علاوہ ۱۹۳۷ء تک قومی خدمات میں بھی پیش پیش رہے۔ انہیں داد کی تمنا ہے نہ صلہ کی خواہش اور نہ آرزوئے شہرت۔ ۱۹۳۰ء سے ادب کی خاموش اور ٹھوس خدمات میں مصروف ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن پر برصغیر ہند و پاک کے مشاہیر اہل قلم اپنے تبصروں میں انہیں زبان و ادب کی سندیں دے چکے ہیں، اس وقت بھی ان کی متعدد کتب، بالخصوص ”تاریخ جامع مسجد، دہلی اور ”یادگار علائی“، زیر تصنیف و طبع ہیں۔

یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے کہ جب یوسف صاحب کو ان کی مشہور تصنیف ”یہ دلی ہے“ پر بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے میر امن کی زبان میں ”دلی کا روڑا“، خطاب عطا کیا تھا اور مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے فرمایا تھا کہ ”میرے لئے تو یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے“، ہم ان سے پہلی بار متعارف ہوئے تھے۔

خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی، یہ روڑا جو دلی کے پرانے آثاروں میں پڑا تھا جب اسے ۱۹۳۷ء کے خونچکان انقلاب نے خاک میں ملانے کی کوشش کی تو در بدر کی ٹھوکریں

کہاتا، اس ارض پاک میں آگیا۔ گو حوادث نے اسے
 برباد کرتے کرتے کنکر بنا دیا ہے لیکن کنکر ہونے
 کے باوجود وہ اپنی سختی اور چمک دمک میں ایک ہیرا ہے۔
 فلک کے جور اور زمانے کی ستم کوشی اب بھی اسے لہو رلاتی
 ہے مگر یہ صبر و وفا کا بندہ خود دار اور سخت جان ہے،
 موت کو زندگی اور زندگی کو موت سمجھتا ہے، مرنے کی آرزو
 میں روز مرتا ہے روز جیتا ہے، موت آتی ہے پر نہیں آتی، یوں،
 تڑپ کر کبھی چیخ اٹھتا ہے۔ ”ہے کوئی نشتر فروش؟“

یہ مقالہ۔ ”خطاطی اور ہمارا رسم الخط“، بھی اس کی
 ایک دردناک اور دل دوز چیخ ہی ہے۔ ”اردو کو بچاؤ،
 اردو کو اپناؤ“، کوئی ہے؟ جو اس کی اس درد بھری چیخ کو
 سنے، اس کے قلب و جگر کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس دل فگار
 یکار پر دھیان دے۔ یہ فریاد گو نحیف اور کمزور ہے مگر
 بڑی پرسوز اور موثر۔

اردو کے ایک ادنیٰ ناشر اور معن ہونے کی حیثیت سے
 ہمارا فرض تھا کہ ہم اسے آپ تک پہنچائیں۔ گل و بلبل
 کے نالے، زلف و سنبل کے افسانے، عشق و محبت کی حکایتیں،
 ناول اور ڈرامے ایک مدت سے سنتے آ رہے ہیں، کب تک
 سنیں کہاں تک سنیں؟ وقت کا تقاضا ہے، وطن کا مطالبہ ہے،
 ملت کی آرزو ہے کہ اول شمشیر و سناں ہو اور طاؤس و رباب
 آخر۔ اردو ہماری شمشیر ہے، اردو ہمارا رباب ہے، بچ رہا ہے
 گو بے آواز ہے۔

محمد ذکی

حرف راقم

یہ مقالہ پہلے صرف خطاطی کی تاریخ اور مختصر تذکرہ خطاطان پر مشتمل تھا۔ موضوع کے اعتبار سے چونکہ ذرا طویل مضمون تھا اس لئے ”ماہ نو“ کراچی کی تین اقساط میں شائع ہوا اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔ رسم الخط کا مسئلہ نا تمام اور باقی رہ گیا۔ اسی اثنا میں ۳۱ - دسمبر ۱۹۵۸ء کو موجودہ حکومت پاکستان کی جانب سے تعلیمی مسائل کی اصلاح و فروغ کے لئے ایک قومی تعلیمی کمیشن مقرر ہوا۔ اس کمیشن نے اپنے دائرہ کار کا اخبارات میں اعلان کیا۔ کمیشن کے دائرہ کار میں رسم الخط کا سوال بھی شامل تھا۔ اس ضمن میں عوام کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لئے ۷ - فروری ۱۹۵۹ء کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تھی اور ہر مکتب خیال سے رسم الخط کے متعلق تجاویز اور آراء طلب کی گئی تھیں تاکہ ان کی روشنی میں کمیشن یہ فیصلہ کرے کہ آیا اردو زبان کو ”رومن“ رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے یا نہیں اور پاکستان میں اس کے رائج اور مقبول ہونے کے کہاں تک امکانات ہیں۔

کمیشن کا یہ اعلان پڑھ کر ہم ایک ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے۔ جی میں آیا کہ مطبوعہ مضمون ”خطاطی“

میں ”رسم الخط“ کے موضوع کا اضافہ کر کے کمیشن کو بھیج دیں اور اس طرح اپنا اظہار خیال ہو جائے۔ ہم ابھی اسی فکر میں تھے کہ اچانک ادارہ ”جنگ“، کراچی اس سہم میں کود پڑا۔ ”جنگ“ کا یہ اقدام نہایت موزوں اور بر محل تھا اور اس کے لئے وہ یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔ جوں ہی ”جنگ“ نے اس سہم کا آغاز کیا، میدان علم میں زبان خلق کے تقارے پر نیزہ خطی کی چوب پڑنے لگی۔ ”اردو“ لشکر کے مجاہدین اور ”لاطینی“ جانباز ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ ایک طرف پرچم اردو اور دوسری جانب روسن پھیرا لہرانے لگا۔ یہ جنگ نصف ماہ تک جاری رہی۔ دونوں فریقوں کے درمیان اہل زبان اور زبان داں ہر ایک کا قلم بے تکان چلا اور زبان و خط کے جوہر کھلے۔ بالآخر اس استصواب رائے کا نتیجہ جو ۹۹ فیصدی اردو رسم الخط کے حق میں نکلا کمیشن کو بھیج دیا گیا۔

اس موقعہ پر ہم نے مصلحتاً اپنی رائے محفوظ رکھی، البتہ استصواب رائے کا نتیجہ برآمد ہونے تک اس جنگ کا بڑے غور سے عینی مشاہدہ کرتے رہے۔ اس دوران میں جو مختلف دماغی کاوشیں ہمارے مطالعہ میں آئیں وہ چونکہ ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب خیال کی ترجمان تھیں اس لئے رسم الخط کے موافق اور مخالف تمام پہلو ہم پر روشن ہو گئے، ساتھ ہی ساتھ ہمارے اس خیال کی بھی جلا ہو گئی کہ ایک زندہ قوم کہلانے کے لئے عوام میں احساس فرض اور قومی شعور کی جس قدر ضرورت ہے وہ بلا شبہ ایک بڑی حد تک اس وقت

پاکستانیوں میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۰ فیصد خواندگی میں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ الغرض اس التوائے عارضی سے ہمارا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا، یعنی اب ہم ان موافق اور مخالف آراء کی موجودگی میں قوم کے اس فیصلہ کو اپنے تبصرہ کے ساتھ ایک جامع صورت میں اپنی حکومت کے سامنے پیش کرسکتے ہیں، چنانچہ اسی نظریہ کے ماتحت ہم اپنے اس مقالہ کو ایک کتابی شکل دیکر اپنی حکومت اور ملت کی نذر کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ تو ہم آئندہ سطور میں تحریر کر رہے ہیں۔ اس مقام پر حکومت اور ارباب حل و عقد کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی کی یہ تحریک کوئی نیا اور عجوبہ شوشہ نہیں ہے۔ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

انیسویں صدی سے اب تک بار بار سماعت میں آچکا ہے۔ جدوجہد آزادی ہی کے ضمن میں غیر منقسم ہندوستان میں ”اردو و ہندی زبان“ اور ”اردو و دیوناگری رسم الخط“ کا تنازعہ مسلسل اور متواتر جاری رہا۔ یہ چیقلش یہاں تک بڑھی کہ متعلقہ و غیر متعلقہ سیکڑوں مسائل پیدا ہو گئے اور انجام کار اس کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا۔ با ایں ہمہ وہاں آج بھی زبان اور رسم الخط کا سوال ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ بھارت کے مختلف صوبے لسانی بنیادوں پر اپنے علاقوں کی تقسیم کا برابر مطالبہ کر رہے ہیں۔

جہاں تک ہمارے پاکستان کا تعلق ہے، ہمارا واسطہ اور رابطہ تقریباً دنیا کے تمام ممالک سے بالعموم اور اسلامی حکومتوں سے بالخصوص قائم ہے۔ یہ دور حاضر سائنس اور ایجادات کا زمانہ ہے۔ علوم و فنون کی کثرت اور شدت ہے بین الاقوامی سیاسی تقاضے، کاروباری اور معاشیاتی مصلحتیں ہیں۔ صحافتی اور ثقافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لئے فنی اور طباعتی دشواریاں ہیں۔ ملکی تعلیمی مسائل اور دفتری نظام کی پیچیدگی ہے۔ ہم نے دیدہ و دانستہ اب تک مذہب کا ذکر نہیں کیا، مبادا ہم پر بھی کٹ ملا یا دقیانوسی ہونے کا کوئی فتویٰ صادر ہو جائے لیکن ظاہر ہے کہ ہم اپنے مذہب عزیز کو کسی بھی قربان گاہ پر بھی نہ چڑھا سکتے۔ رسول اکرم ص نے عالمگیر اسلامی قومیت کیلئے ہر چیز میں یکتائی اور انفرادیت پیدا کی۔ قومیت کا یہی وہ احساس تھا جس نے ہمیں اول مسلمان اور بعد میں پاکستانی کے لقب سے ملقب کیا۔

سر سید اعظم علیہ الرحمہ کے بعد ارض پاک کے مفکر و شاعر اعظم ڈاکٹر اقبال مرحوم اپنے دم آخر تک گیسوئے اردو کی شہام نوازی اور شانہ آرائی کرتے رہے پھر بھی ان کے خیال کے مطابق عروس اردو کی مانگ منت پذیر شانہ رہ گئی اور گیارہ طویل برس گذر جانے کے باوجود هنوز منت پذیر شانہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عرصہ میں عاشقان زلیخائے اردو اس کی شانہ آرائی سے یکسر غافل رہے انہوں نے تو اپنی بساط کے مطابق غالباً اس سے بھی بڑھ کر مشاطگی کی۔ اس کی دلجوئی اور دلداری میں یہاں تک کیا کہ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت،

ہندی ، بنگالی ، سندھی ، گجراتی اور پشتو وغیرہ جو اردو کی قدیم ہمجولی ، سہیلی ، بھیلی اور منہ بولی بہنیں تھیں ان سب کو اس کے آس پاس رکھا ، انتہا تو یہ ہے کہ ”انگلش سسٹر“ کو بھی آس کے پہلو میں جگہ دی سب سے رشتے ناطے استوار اور تعلقات خوشگوار رکھے ۔

لگن یہ تھی کہ اس میل ملاپ کی فضا میں کوئی مبارک دن دیکھ کر کسی سبھ گھڑی اس ہندی ، پاک خوبرو دلہن کا کسی عالمگیر ادب سے بیاہ چائیں اور خوشیاں منائیں لیکن کیا کیا جائے قائد اعظم اور قائد ملت کی جنتی روحوں کے بعد عقد کی باگ ڈور ان خود غرض سیاسی قضات اور حاکمان وقت کے ہاتھوں میں آئی جو یکے بعد دیگرے ، پے درپے ، مسلسل اور پیہم اپنی زبردستی سے ہمارے سروں پر مسلط رہے۔ ان کو اس عقد نیک کی نہ کوئی فکر تھی اور نہ کوئی خوشی ۔ روز ، روز عید اور شب ، شب برات مناتے رہے ، ہم روتے اور جلتے رہے ع

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

وہ سب اپنے ہی تھے ، اس لئے ہم خاموش رہے۔ ہمارا سر تسلیم خم رہا ، مزاج یار کو دیکھتے رہے ۔ بے نیازی حد سے گذر گئی ۔ بندہ پروروں سے حال دل کہتے کہتے اور ”کیا !“ سنتے سنتے کلیجہ پک گیا ۔ انہوں نے ہمیں عاشق سمجھا اور صحیح سمجھا ۔ عشق لیلی اردو کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ناخنوں کی کاوش سے بھی ہم لذت محسوس کریں ۔ آخر

خطاطی

مشہور عربی مقولہ ہے ”الخط ریاض العلوم“ اور ”القلم سفیر العقل“۔ جعفر برمکی کا قول ہے کہ خط حکمت کا دھاگا ہے جس میں ناسفتہ موتی پروئے جاتے ہیں، شیخ شمس الدین الاکفانی کے الفاظ میں خط کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ صرف معانی و مفہوم ادا کرتے ہیں اور خط الفاظ کے حسن صوری کو پیش کرتا ہے۔

ان اقوال سے خط کی اہمیت بخوبی واضح ہوتی ہے، بلاشبہ اگر یہ فن لطیف ایجاد نہ ہوتا تو ہزاروں میل دور افتادہ لوگوں سے روحانی ملاقات کیونکر ہوتی۔ افسوس! خط کا ماخذ اسقدر تاریک ہے کہ یقین کے ساتھ یہ بتانا محال ہے کہ وہ کب ایجاد ہوا۔ فنون لطیفہ کا یہ موضوع جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر کٹھن بھی۔ گو یہ مختصر مقالہ اس دفتر عظیم کا مستحمل نہیں ہو سکتا، تاہم تاریخ کی روشنی میں ہم ایک مختصر سا اجمالی خاکہ پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ خط کی پیدائش کے اسباب کیا تھے، وہ کیونکر وجود میں آیا اور پھر اپنے ارتقائی اور تدریجی منازل سے گذر کر موجودہ خطوط نسخ اور نستعلیق تک کس طرح پہنچا۔

تخلیق زبان: انسان کے عناصر ترکیبی، ”آب، آتش، خاک اور باد“ میں فوقیت اور برتری ہوا کو حاصل ہے، ہوا کو ہم با الفاظ دیگر سانس یا نفس کہتے ہیں، انسانی زندگی کا دار و مدار اسی سانس کی آمد و رفت پر ہے اور یہی اسکا نشان حیات ہے۔ اس سانس کو خدا نے مختلف آوازوں سے مکلف کیا ہے۔ چنانچہ پیدائش کے وقت بصورت گریہ ”ہیاؤں، ہیاؤں“ کی جو آواز نوزائیدہ بچے کے کام و دہن سے نکلتی ہے وہ اسکی سب سے پہلی اور قدرتی آواز ہے جسے ہم نطق یا گویائی کہتے ہیں۔ خدا نے یہ گویائی وحوش کو بھی عطا کی ہے، ان کے منہ سے بھی پیدا ہوتے وقت مختلف قسم کی آوازیں نکلتی ہیں۔ انسان بذات خود ایک نوع حیوان ہے اور انسان اور حیوان دونوں ایک ہی قانون قدرت کے تابع ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انسان اور حیوان دونوں کی آوازوں میں کسی حد تک ایک فطری یگانگت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یوں تو ہمارا پالتو طوطا ہمارے پڑھائے اور رٹائے ہوئے الفاظ ”مٹھو بیٹے، پاک ذات اور حق اللہ“ نہایت صاف اور لے تکان ادا کرتا ہے لیکن جونہی وہ ہمارے پاؤں کے نیچے یا بلی کے چنگل میں آتا ہے تو یک لخت اپنا سبق بھول کر اپنی فطری آواز میں صرف ”ٹیس“ کر کے رہ جاتا ہے، اسی طرح بحالت خوف جب انسان اچانک چیختا ہے تو اس کے منہ سے لفظ ”ہو“ نکلتا ہے، اس کی یہ آواز سراسر حیوانی ہے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی زبان بھی ابتدا میں صرف اصوات کا مجموعہ تھی۔

الغرض انسان اور حیوان دونوں ابتدائے آفرینش سے ناطق اور گویا ہوتے ہیں کوئی گونگا نہیں ہوتا۔ ہم ان افراد کو بھی گونگا نہیں کہہ سکتے جو پیدائشی گونگے پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل ان کے عضلات اور اعصاب کام و دھن پیدائشی نقص کے باعث صرف نطق سے محروم ہوتے ہیں آواز سے نہیں، اس نظریہ کا اطلاق ان حیوانات پر بھی ہوتا ہے جو آواز سے تو محروم نہیں لیکن قوت گویائی نہیں رکھتے اور یہی وہ صفت اور جوہر ہے جو انسان کو حیوان سے افضل اور ممتاز کرتا ہے۔

ابتداء میں انسان اور حیوانات کی یہ آوازیں بے ربط اور سہمہل تھیں لیکن وقت اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہی آوازیں کانوں کی راہ سے دل و دماغ میں رستی اور بستی سے مختلف اشارات میں ڈھلتی گئیں، ہر آواز ایک خاص مقصد کو واضح کرنے لگی، بس اسی کا نام زبان ہے۔ ضرورت ہمیشہ سے ایجاد کی ماں اور عقل کار ساز رہی ہے، عقل کی رہنمائی میں مختلف اصوات کا یہ عطیہ (اشارات و سکانات) آہستہ آہستہ ایک مدت مدید میں حروف، اور حروف سے با معنی اور سہمہل الفاظ کے روپ میں سامنے آنے لگا۔ ابتدا میں یہ تمام الفاظ مفرد تھے جب انکی تعداد زیادہ ہو گئی تو مرکب الفاظ کی باری آئی، ان کی بنیاد بھی انہی اصوات کی مرہون منت تھی۔

محققین اور ماہرین السنہ کی یہ متفقہ رائے ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں ایک تہائی تعداد صرف ان حروف کی ہے جنکو اصوات کی بنیاد پر وضع کیا گیا تھا اور متعدد ایسے الفاظ ہیں

جنکی تشکیل مشابہت یا حرکات و سکنات ظاہری کی اساس پر
صرف و نحو کے قواعد کے ماتحت عمل میں آئی ہے مثلاً
آواز (۱)
لفظ

سرسراہٹ	سے	۱ - ہوا کی سائیں سائیں
کھڑکھڑاہٹ	سے	۲ - خشک پتوں کی آواز
گھڑگھڑاہٹ	سے	۳ - چکی کی آواز
گر ج	سے	۴ - بادل کی آواز
کڑک	سے	۵ - بجلی کی آواز
قائیں قائیں	سے	۶ - کوئے کی آواز
جھیں جھیں	سے	۷ - جھینگر کی آواز
بھنبھناہٹ	سے	۸ - مکھی کی بھن بھن
چھم چھم	سے	۹ - پانی گرنیکی آواز

متعدد (۲) افعال ظاہری مشابہت اور ظاہری حرکات
سے وضع ہوئے، مثلاً ”اجگر“ ”آج“، سنسکرت میں بکری کو
کہتے ہیں اور ’گر‘ بمعنی نگلنا، اس مشابہت کی وجہ سے
اجگر بنا یعنی بکریوں کو نگلنے والا اڑدھا۔ ”کنکھجورا“
اس کا مادہ ’کن‘، اور ’کھجور‘ ہے اس کیڑے کی جسمانی
ساخت کھجور کے درخت سے مشابہ ہے اور فطرت یہ ہے کہ
سوئے وقت کان میں گھس جاتا ہے۔

جہاں تک انسانی آواز کا تعلق ہے، اس کا سرچشمہ
کام و دھن ہے جو رباطات، عضلات، اعصاب اور عروق کا

مجموعہ ہے۔ سانس کے ذریعے منہ سے ہزاروں قسم کی آوازیں نکلتی ہیں، چونکہ قدرت نے ہر کام و دھن کی ہیئت اور ساخت جدا جدا رکھی ہے، نیز آب و ہوا کے اختلاف سے بھی زبان متاثر ہوتی ہے لہذا اس بنیادی اور عالمگیر فرق کے باعث دنیا کے ہر فرد و بشر کا لب و لہجہ اور آواز کا زیر و بم بھی الگ الگ ہے۔ جزوی مماثلت چنداں قابل لحاظ نہیں، اس قدرتی نظام سے دنیا کی کوئی زبان مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔

اس تشریح سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس ہوا کا نام سانس ہے وہی حروف کا منبع و مخرج ہے۔ جب سانس سے آوازوں کا ظہور ہوا تو ہر سانس میں تین قسم کی لہریں پائی گئیں، موسیقی کی اصطلاح میں ان لہروں کو ”سر“ کہتے ہیں اور وہ سر آ۔ ا اور آ ہیں۔ ان تین سروں سے ہزاروں بول اور راگ جنم پاتے ہیں۔ انہی لہروں کو زبان میں ”اعراب“ کہا جاتا ہے جو ا۔ ی اور و ہیں۔ اہل عرب نے ان کو حروف علت قرار دیا ہے کیونکہ تمام حروف کا تانا بانا انہی کی نقل و حرکت اور گردش پر موقوف ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ تمام دنیا کی حروف ابجد کا پہلا حرف الف (ا) ہے۔

ساحصل یہ کہ ابتدا میں ازل اصوات و حرکات سے مفرد حروف (ابجد) اور مرکب الفاظ وضع ہوئے پھر کلمات بنائے گئے بعد ازاں ان میں حرف روابط اور ضمائر داخل ہوئے، ادھر دھنی عضلات اور آب و ہوا کی بوقلمونی نے اس میں رنگا رنگی پیدا کی اور بالآخر مختلف ممالک میں مختلف اشکال اور تعداد میں حروف تہجی مقرر ہوئے اس طرح صدہا زبانیں وجود میں آئیں۔

اہل ذوق چاہیں تو اس باب میں مستند لغات، تذکرہ و تواریخ السنہ اقوام سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب غالباً ”امتحان الفضلاء“ (تذکرہ خطاطان) ہے جسکو مرزا سنگلاخ نے ۱۲۹۱ھ میں تہران سے شائع کیا۔ دوسرا تذکرہ ”خط و خطاطان“ مصنفہ حبیب آفندی ترکی زبان میں ہے، ۱۳۰۶ھ میں قسطنطنیہ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں عراق و عجم کے ۳۴ خوش نویسوں کا ذکر ہے۔ تیسرا تذکرہ فرانسیسی زبان میں کلیمنٹ ہوراٹ کا ہے جو ۱۹۰۸ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ چوتھا تذکرہ — مفتاح الخطوط — رضا اللہ شاہ قادری ہندی کی تصنیف ہے لیکن اس میں ہند و پاکستان کے ارباب فن خط کا کوئی ذکر نہیں۔ پانچواں تذکرہ مولانا غلام محمد دہلوی کا ہے۔ یہ مختصر تاریخ خطاطی زبان فارسی میں ہے۔ اسے ۱۹۲۰ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا تھا۔ اس باب میں جن ماخذوں سے ہم نے کام لیا ہے ان میں بلاشبہ فرہنگ آصفیہ، اصطلاحات پیشہ وراں اور علم الحروف یا تحقیقات ماہر، نہایت ہی مفید اور کارآمد نسخے ہیں۔ ہم نے ان تینوں کتابوں سے بالعموم اور تحقیقات ماہر سے بالخصوص کافی استفادہ کیا ہے، ہماری بیشتر معلومات تحقیقات ماہر کے اقتباسات اور تلخیص پر مشتمل ہیں۔

تاریخ السنہ اقوام: آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ زبان سے کتابت یا خطاطی کا رشتہ کیونکر قائم ہوا۔ ابتدا میں انسان وحشی اور غیر متمدن تھا۔ ایک مدت دراز کے بعد

جب اُس نے انسانیت کے دائرے میں قدم رکھا اور متمدن ہوا تو اپنے مرکز سے دنیائے عریض و بسیط کے گوشوں میں جا بجا آباد ہو گیا، آپس میں ایک دوسرے کا حال دریافت کرنے کی فکر لاحق ہوئی نیز قومی اور سلکی حالات میں انقلابات پیش آئے تو اُن کو محفوظ رکھنا ضروری خیال کیا گیا۔ ابتدا میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اظہار خیال کیلئے محض چند اشارات وضع ہوئے تھے، اشارات کے مقابلہ میں الفاظ کی تعداد زیادہ تھی، ظاہر ہے کہ تمام الفاظ کو دماغ میں محفوظ رکھنا ناممکن تھا۔ حافظہ اور یادداشت کی اس خاصی کیوجہ سے انہوں نے ابتدا میں چند نقوش اور تصاویر سے کام لیا ہر واقعہ اور مادی خیال کو تصویر کی صورت میں پیش کرنے لگے۔ مثلاً ایک بادشاہ کو ایک شیر نے ہلاک کر دیا۔ چونکہ یہ ایک اہم واقعہ تھا اس لئے انہوں نے پتھر پر ایک تصویر بنائی کہ ایک شیر انسان سے لڑ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھا خط کا وہ پہلا خاکہ جو دور صوری مادی کہلایا۔

تحقیقات ماہر میں رسالہ الهلال مطبوعہ مصر (۱۹۳۳ء) کے حوالہ سے ایک مصور ٹھیکرے کا ذکر کیا گیا ہے جو شہر تیب جورا (مابین دجلہ و فرات) میں آثار قدیمہ سے برآمد ہوا تھا۔ اس ٹھیکرے پر حضرت آدم و حوا کی وہ تصویر منقش ہے جسکا تعلق اُن کے اخراج جنت کے واقعہ سے ہے۔ یہ تصویر ۳۷۰ ق م کی خیال کی جاتی ہے یہ تصویر ثابت کرتی ہے کہ انسان زمانہ قدیم ہی سے دنیا کے مشہور واقعات قلمبند کرنے کے لئے کس درجہ بیقرار تھا۔ مصر کے مورخوں کا خیال

ہے کہ حضرت ابراہیم کی ولادت - ۱۹۹۶ ق م سے دو ڈھائی
ہزار برس قبل مصر میں "خط تمثال" جاری تھا۔

پھر ایک زمانہ دراز کے بعد تصاویر کی بجائے مخصوص
اشارات سے کام لیا گیا۔ مثلاً اظہار دشمنی کے لئے سانپ کا ایک
کنڈل بنایا گیا۔ آسمان ظاہر کرنے کیلئے نصف قوس کھینچی
گئی، دریائی سفر کے لئے کشتی کا خاکہ دکھایا گیا وغیرہ
وغیرہ یہ دور صوری معنوی مشہور ہوا۔

رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ جب حالات اور واقعات نے
نت نئی کروٹیں بدلیں اور بڑے بڑے واقعات پیش آئے تو ان
کو ہر بڑے واقعہ کی وضاحت کیلئے ایک کی بجائے کئی کئی
تصاویر سے کام لینا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل بڑا کٹھن اور
دشوار تھا۔ لہذا انہوں نے تصویر کشی کو خیر باد کہہ کر
مختلف اجسام و اشکال پر مشتمل چند علامتیں (حروف ابجد)
مقرر کیں، اس طرح الف تا یائے تمام تہتانی حروف مرتب ہوئے۔
اس ایجاد سے ایک تو ان کو مصوری کی زحمت سے نجات ملی،
دوسرے ان کی پہلی مصوری کے پرتو نے حروف کے قالب میں
ایک نئی جان ڈال دی۔ اس دور کو صوری حروف سے تعبیر
کیا گیا اور یہی اقوام عالم کی کتابت کا سنگ بنیاد قرار پایا۔
جب اس حد تک دسترس حاصل ہو گئی تو انہوں نے
عقل و فراست کی رہنمائی میں حروف کو ترتیب دینا شروع
کیا، اس ترکیب سے لفظ اور الفاظ سے جملے بنانے شروع
کئے۔ یہ چوتھا حرفی دور تھا لیکن جیسا کہ ہم ابتدا میں
کہہ چکے ہیں کہ جب ماخذ بالکل تیرہ و تار ہو تو ٹھیک ٹھیک

بتانا محال ہے کہ ابجد کس زمانہ میں ایجاد ہوئی۔ تواریخ کی رو سے صحیح اندازہ اور سنین کا شمار زیادہ سے زیادہ طوفان نوح کے زمانہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور باقی تمام قیاسات ہیں۔ آئیے، اسی بنیاد پر ہم بھی تواریخ کی روشنی میں قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔

طوفان نوح سے چار ہزار برس قبل مسیح بابل میں حکومتوں کا قیام ہوچکا تھا اور سلطنتوں کے دائروں میں کتابت جاری تھی۔ اس زمانے میں جو خط جاری تھا وہ سومری کہلاتا تھا سومری قوم دراصل سامی عرب تھے، اور سام حضرت نوح کے فرزند تھے لہذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے وقت حضرت نوح کی کیا عمر تھی؟

توارة (۱) مقدس باب پیدائش نمبر ۹ آیت نمبر ۲۹ مطبوعہ لندن (۱۸۸۷ء) کی رو سے حضرت نوح نے ۹۰ برس کی عمر پائی اور طوفان کے بعد ۳۵ برس تک زندہ رہے، طبری (۲) (صفحہ ۱۹۸، جلد اول) مطبوعہ لیڈن، ہالینڈ کی تحریر کے مطابق طوفان کے وقت حضرت نوح کی عمر ۶۰۰ سال تھی، اس کے بعد ۳۳۸ برس حیات پائی۔ یعقوبی (۳) (صفحہ ۱۳، جلد اول) مطبوعہ ہالینڈ میں تحریر ہے کہ قرآن پاک کی صراحت کے مطابق حضرت نوح نے ۹۰ برس کی زندگی پائی۔ متعدد محققین جغرافیہ نے کافی تحقیقات کے بعد طوفان نوح کے متعلق جو سنین قائم کئے ہیں ان میں بائبل

مبعینہ (Sepugint) (۱) کا نسخہ سب سے زیادہ معتبر مانا جاتا ہے کیونکہ اس نسخہ کی ستر علماء بنی اسرائیل نے صحت کی تھی۔ اس نسخہ کی رو سے طوفان نوح ۳۲۴۶ ق م آیا تھا۔ اب اگر ان اعداد میں ۶۰۰ برس اور جمع کئے جائیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ۳۸۴۶ ق م بابل میں خط سومری رائج تھا۔

اسی تاریخ ابجد کے ضمن میں ہمارے سامنے ایک اور دلچسپ تحقیق موجود ہے۔ علامہ ابن ندیم (۲) کی روایت کے بموجب حضرت آدم نے اپنی وفات سے ۳۰۰ برس قبل آن صحائف آسمانی کو جو آن پر نازل ہوئے تھے اینٹوں پر لکھا تھا، جبکہ بابل میں سومری قوم (۴۰۰۰ ق م) حکمران تھی۔ اب اگر کتابت کا آغاز حضرت آدم کے عہد سے مانا جائے تو اس حساب سے بابل میں تقریباً ایک ہزار برس پہلے کتابت جاری تھی۔ ہمارے خیال میں اسکی شرح یوں کی جاسکتی ہے کہ اول حضرت آدم نے آسمانی صحائف کو اینٹوں پر لکھا پھر تحفظ کے خیال سے ان اینٹوں کو پختہ کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ خشتی کتبات طوفان نوح میں غرق ہو گئے تھے۔ ابن ندیم کی یہ روایت اس لحاظ سے بھی قابل تسلیم ہے کہ بابل کے آثار قدیمہ سے عہد اشور بنی پال (۶۶۸ ق م) وغیرہ کے خشتی کتبات برآمد ہو چکے ہیں جن پر پوری کتابیں تحریر ہیں اور یہ وہ طریقہ تھا جس کے موجد حضرت آدم تھے۔

جرجی زیدان اپنی تاریخ مصر الحدیث مطبوعہ مصر میں رقم طراز ہے کہ مصر کی قدیم تاریخ مختلف خاندانوں پر

مشمول تھی۔ مصر میں حکومت کا آغاز ۳۰۰۰ ق م سے ہوا تھا اور مصر کے پہلے خاندان کا بادشاہ میتاؤس تھا۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس بادشاہ کا جو مقبرہ برآمد کیا ہے اس کی برآمد شدہ نادر اشیاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایک ایسا خط رائج تھا جو بلا تکلف لکھا جاتا تھا۔ یقیناً اس لحاظ سے یہی دنیا کا قدیم ترین خط سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ بجز اس خط کے مورخین کو کوئی دوسرا خط اب تک حاصل نہیں ہوا۔

اسلامی عقیدے کے مطابق ہر علم و فن کا آغاز وحی الہی سے ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کون سا خط تھا جس میں حضرت آدم پر صحائف نازل ہوئے اور ان کے بعد حضرت ادریس نے کون سے خط کو ترقی دی۔ کتاب التیجان مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن میں حضرت وھت سے روایت ہے کہ حضرت ادریس پر پہلی وحی میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ اور تیسری وحی میں پوری ابجد نازل ہوئی اور یہ سریانی زبان میں تھی نیز یہ کہ حضرت ادریس دنیا میں پہلے کاتب ہیں۔ یہ روایت اول الذکر روایات کی تردید کرتی ہے لیکن اسکی تطبیق اسطرح ہوسکتی ہے کہ حضرت آدم کے عہد میں جو ابجد نازل ہوئی تھی اسکی تکمیل حضرت ادریس نے فرمائی۔ بہر نوع چونکہ حضرت آدم اور حضرت ادریس کے عہد کے خطوط کا آج کوئی نمونہ دنیا میں موجود نہیں ہے اس لئے اس پر مزید بحث خارج از بحث ہے۔ علامہ ابوالعباس قلقشندی کی کتاب ”صبح الاعشی“ مطبوعہ مصر کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک انبیاء کرام کے خط وحی کا تعلق ہے اسکا نام

”توفیقیہ“ ہے اور اُس میں جو اضافے ہوئے اسکا نام ”خط اصلاحیہ“ ہے۔

ان امور سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں جسقدر نمونے خطوط کے موجود ہیں انکی تاریخ مصر سے شروع ہوتی ہے اور مصری ہی ابجد یعنی خط کے موجد قرار پاتے ہیں اگر ان تمام خطوط کے باہمی تعلق اور ان کی ارتقائی کیفیتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو ایک شجرہ مرتب ہو جاتا ہے جسکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ شجرہ کی مدد سے تمام خطوط با آسانی سمجھ میں آجائیں گے۔ یہ خطوط حسب ذیل ہیں:

خط سریانی : اس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

خط سطرنجیلی 'المخفف' السرطا : ان خطوط کی ایجاد

مصری خطوط کے زوال اور فنیقیہ کے بعد ہوئی۔ ان میں سطرنجیلی آگے چل کر ایک کامیاب خط کی صورت میں ابھرا اور خط کوفی قدیم کے لئے ایک بنیادی خط ثابت ہوا۔ باقی دونوں خطوط گوسریانی کی مشہور شاخیں ہیں لیکن وقتی طور پر پیدا ہوئے اور فنا ہو گئے۔ بنیادی خطوط ہونیکی وجہ سے ان کو علیحدہ شجرہ کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

خط سومری : یہ خط قدیم اہل بابل کی یادگار ہے جو طوفان

نوح سے ۴ ہزار برس قبل مسیح رائج تھا اس کے موجد سامی عرب تھے۔

مسماری، پیکانی یا میخی : خط مسماری کو کلدانیوں

(عراقی، بابلی، اشوری) نے فنیقی قوم سے سیکھا تھا جسکی

ابتدا حضرت ابراہیم سے ہوئی۔ یہ خط ابتدا میں مصور تھا۔
حمورابی خاندان نے جو (۲۳۶ ق م) بابل پر حکمران تھا اسے
پیکانی یا میخی خط میں تبدیل کر دیا۔ اسکی شکل آہنی میخوں
یا تیروں سے مشابہ تھی۔

مقدس ہیر و غلیفی : یہ مصریوں کا سب سے پہلا مذہبی
خط تھا اسکا ہر حرف مصور تھا۔ اس کے کاتب مندر کے پیجاری
تھے جو پتھروں اور لکڑی کے تختوں پر لکھا کرتے تھے۔
اہل مصر چونکہ ابتدا میں وحوش کی پرستش کیا کرتے تھے
اس لئے اظہار خیال کا ذریعہ حیوانات کی تصاویر قرار دیا گیا
مکمل ابجد انہی تصاویر میں بنائی گئی۔ آسانی کے خیال سے
انہوں نے اس کی دو قسمیں کر دیں :

ہیرا طیقی (ہیرا ٹک) : یہ پہلی قسم تھی جسکا تعلق
براہ راست مذہبی احکامات سے تھا یہ خط شاہی دفاتر میں
جاری تھا۔ اگرچہ یہ کافی رواں تھا لیکن حروف میں کچھ
کجی تھی اس لئے ہیرا ٹک کم لایا۔ اس خط میں پوری تصویر
کا صرف ایک جزو باقی رہ گیا اور کاغذ پر لکھا جانے لگا۔
حضرت ابراہیم سے . . . ہر س قبل کی کتابیں اس خط میں
موجود ہیں۔

ویمو طیقی (وڈاٹک) : یہ دوسری قسم تھی اس میں
پہلے خط سے زیادہ روانی تھی مصر میں جب سولہواں خاندان
حکمران تھا اس وقت یہ خط اپنے پورے شباب پر تھا۔ اس
تقسیم سے مصریوں کو ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ مصوری
کی زحمت سے قدرے نجات مل گئی۔

فنیقیہ (۱) : (اہل فنیشیا) مصریوں کے شاگرد ہوئے اور انہوں نے ہیرو غلیفی سے اپنا جداگانہ خط پیدا کیا جو مصری خطوط سے زیادہ واضح اور شاندار تھا، اس طرح عہد قدیم کے یہ چار خط اصل قرار پائے اور انکی شاخیں تمام دنیا میں پھیلیں۔

مربع عبرانی : عبرانیوں میں ان کا ایک قدیم خط رائج تھا، جدید مربع عبرانی دراصل فنیقیہ قوم کا عطیہ ہے جس کی بنیاد (۵۶۰ ق م) بابل میں پڑی۔ یہ خط فنیقیہ سے زیادہ مہذب اور واضح تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عربی عبرانی کی شاخ ہے یہ غلط ہے۔ عربی بجائے خود ایک مستقل زبان ہے۔ دراصل حضرت عبیر جن کے نام سے یہ زبان اور خط مشہور ہوا حضرت نوح کی اولاد سے تھے۔

قدیم یونانی : یونانیوں کا اپنا کوئی خاص خط نہ تھا۔ انہوں نے مصریوں سے اسکی تعلیم حاصل کی لیکن جب یونانی مصر پر قابض ہو گئے تو انکی حکومت کے زیر اثر تینوں مصری خطوط زوال میں آ گئے۔ اب یونانیوں نے فنیقی خط کو سامنے رکھ کر قبطنی خط میں یونانی حروف شامل کئے اور اپنا جداگانہ رسم الخط ایجاد کیا۔ قبطنی خط بھی یونانی حروف سے مرکب تھا جو آغاز اسلام

۱۔ یہ قوم ابتدا میں ساحل بحرین اور خلیج فارس پر آباد تھی جب اس پر یورش ہوئی تو نواح یمن میں آباد ہوئی پھر دوسرے انقلاب میں ارض کنعاں (شام) پہنچی۔ ساحل روم پر شہر صور (ٹائر) اور صیدہ (سیدان) انہی کی یادگار ہیں اسی قوم نے کلدانیوں، یونانیوں اور عبرانیوں کو کتابت اور تجارت کی تعلیم دی، از تحقیقات ماہر ۱۲۔

تک جاری رہا لیکن خلیفہ ولید بن عبدالملک اسوی کے گورنر
عبداللہ نے ۵۸۷ م ۶۰۶ء میں اس خط کو عربی خط میں
تبدیل کر دیا۔

ارامی یا سامی : سلطنت اشوریہ (بابل) جب رو بہ زوال ہوئی

تو اس کی ابجد، جس کا تعلق فنیقیہ سے تھا، متمدن دنیا میں پھیلی۔
اس سے چند قلم پیدا ہوئے۔ ان میں ایک خط ارامی تھا۔ ارام
حضرت سام کے بیٹے اور حضرت نوح کے پوتے تھے۔ یہ قبائل
ساحل بحرین پر دیگر عربوں کے ساتھ آباد تھے۔ جن کی زبان
قریب قریب بالکل عربی تھی جس میں ارامی زبان کے مادے
بھی بکثرت شامل تھے۔ ابتدا میں فنیقیہ اور ارامی خطوط میں
بھی زیادہ فرق نہ تھا کیونکہ ارامی خط فی الاصل مصری
خطوط کو سامنے رکھ کر معمولی فرق کے ساتھ جاری کیا گیا
تھا۔ بعد میں یہ فرق نمایاں ہو گیا۔

جب سامی اقوام کا متمدن دنیا سے ربط ضبط بڑھا تو
انہوں نے اپنی قدیم زبان سومری کے علاوہ ارامی زبان اور خط
دونوں کو اختیار کر لیا۔ اسی لئے ارامی خط کا دوسرا نام سامی
ہے۔ اس کی دو شاخیں مشہور ہیں۔

قد سری : یہ ارامی خط کی پہلی شاخ ہے۔ دراصل یہ قلم
تدمر (پال مائر) کے شہریوں کا تھا۔

نبطی : یہ دوسری مشہور شاخ ہے۔ اصل میں یہ قلم پڑا یا بطرا
والوں کا خط تھا جو بدین، ارض سینا، فلسطین اور حوران (ممالک شام)
میں رائج تھا۔ نبطی دراصل حضرت اسماعیل کی اولاد ہیں۔ حضرت

اسماعیل کے ایک صاحبزادے کا نام "نابت"، تھا۔ دو تین صدی قبل مسیح نبطیوں کی حکومت نجد سے سواحل بحر احمر، عقبہ اور بادیہ شام تک دراز تھی۔ ان کا مرکز شہر بطرا تھا اور زبان عربی تھی۔ ابتدا میں ان کا خط مسماری تھا جو انہوں نے سومریوں سے حاصل کیا تھا۔ سامیوں کی طرح جب نبطیوں کے بھی تمدن دنیا سے تعلقات پیدا ہوئے تو وہ سیاسی و تجارتی اغراض کے ماتحت اپنا مسماری خط چھوڑ کر آرامی خط میں کتابت کرنے لگے۔

مسند یا مسند سبائی : شمالی عرب میں خط آرامی کی تیسری شاخ مسند سبائی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ موجودہ دور میں یمن کی جو تاریخ کتابت آثار قدیمہ سے مرتب کی گئی ہے اس میں یمن کے تین دور دکھائے گئے ہیں۔ اول ملوک معین، دوم ملوک سبا اور سوم ملوک حمیر۔ یہ تمام بادشاہ نسل کے اعتبار سے ایک تھے لیکن ان کی حکومتوں کا زمانہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ ادل معین کی زبان سبائیوں سے مشابہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انکی ابجد مسند حمیری کے نام سے مشہور ہوئی جس کا بیان آگے آئیگا۔ مسند سبائی سے تین قلم نکلے۔

صفوی : علاقہ حوران (شام) میں جبل صفا واقع ہے، وہاں کے تمام کتابت صفوی کہلائے۔

136366

ٹھوڈی : ثمود عرب کی قدیم قوم تھی، اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔

لحیانی : شمالی عرب میں لحيان مشہور قبیلہ تھا، اس کی کنیت سے لحيانی خط مشہور ہوا۔

قبل اس کے کہ ہم مسند حمیری اور حیری یا قدیم کوفی کا ذکر چھیڑیں۔ قدیم خطوط کے ضمن میں حیثی، چینی اور جاپانی خطوط کا تذکرہ کریں گے تاکہ یہ سلسلہ اپنی جگہ مکمل ہو جائے۔ ان تینوں خطوط کو بھی شجرہ میں علاحدہ دکھایا گیا ہے۔

حیثی : ولادت حضرت مسیح سے قبل حیثی ایک قوم تھی جو فراعنہ مصر کی ہم عصر تھی۔ یہ شام سے ایشیائے کوچک تک آباد تھی۔ اسکا خط بھی ہیرو غلیفی کی طرح سمجھور مگر بھدا تھا۔ شہر حماثہ (شام) میں اس خط کے کتببات بر آمد ہوئے ہیں۔

چینی : ایشیائی خطوط میں چینی ایک عجیب اور دلچسپ خط تھا کیونکہ اسکی کتابت اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ چینیوں کا اعتقاد تھا کہ فیضان الہی کا نزول آسمان سے زمین کی طرف ہوتا ہے۔

جاپانی : یہ خط درختوں کی شاخوں کی طرح پیچدار تھا، اس لئے اہل عرب اپنی اصطلاح میں اسے شجر کہتے تھے، اس کی دو قسمیں ہیں : کٹکنا، ہیرا گانا۔ دراصل یہ دونوں جاپانی اور قدیم مغربی چینی خط ہی کی شاخیں ہیں۔ سریانی، عبرانی اور عربی خطوط دائیں سے بائیں جانب لکھے جاتے تھے ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان سے حرکت طبعی کا آغاز ہمیشہ دائیں ہاتھ اور دائیں قدم سے ہوتا ہے۔ جیسے آسمان دائیں سے بائیں یعنی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہندی، قبطی، رومی اور قدیم فارسی خطوط کی کتابت بائیں سے دائیں جانب ہوتی تھی، کیونکہ حکمائے یونان کی تحقیق کے مطابق دوران خون قلب سے شروع ہوتا ہے اور قلب بائیں جانب ہے، نیز قلب عقل کا مرکز ہے۔

مسند حمیری : ہیروغلیفی سے ارامی یا سامی خط تک (مربع عبرانی اور یونانی قدیم کو نظر انداز کرتے ہوئے کیونکہ وہ خارج از بحث ہیں) خطوط کی پانچ منزلیں پوری ہوتی ہیں چھٹی منزل سطرنجیلی (شاخ فنیقیہ) خط تھا جو ظاہر ہے کہ مسلسل پانچ دور گزر جانے کے بعد نہایت واضح اور روشن بن چکا تھا لیکن جب اسے نبٹیوں نے اختیار کیا تو اس میں پھر گنجلیک پیدا ہو گئی جس کا عظیم رد عمل یمن میں جا کر ہوا۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سطرنجیلی اور نبٹی کے لطیف امتزاج سے مسند حمیری وجود میں آیا۔

حیری یا قدیم کوفی : مسند حمیری کو اہل حیرہ نے مناسب اصلاح کے بعد اور بھی آراستہ اور مہذب کیا اور یہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَوِ • مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ •

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ • وَمِنْ شَرِّ

النَّفَّاثِ فِي الْعُقَدِ • وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا

سُوِيَ النَّاسُ حَسَدًا •

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ • مَلِكِ النَّاسِ • إِلَهِ

النَّاسِ • مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ •

الَّذِي يُوسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ • مِنَ الْغَيْبِ

وَالنَّاسِ خَسِيسٍ •

کتبہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر
سنہ ۱۰۶۴ھ




اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا

ایک صفحہ

شجرانِ الاثان حضرت سید المرسلین ﷺ بنام سلطانِ مقوقس مصر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مُحَمَّدٌ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ
 سَوَّلَهُ الْاِلٰهَ وَرَسُولَهُ عَظِیْمًا لَقِیْتُ سَلَمًا عِزًّا
 مِمَّا اطْعَمَ الْعَدُوَّیَّ كَادَ حَاہُ سَلَمًا عِزًّا
 وَبَكَرًا لِلّٰہِ كَادَ حَاہُ سَلَمًا عِزًّا
 فَلَیْسَ بِوَالِدِكَ فَهَلْكَ اَمْ فَكَلْبًا لَقِیْتُ سَلَمًا عِزًّا
 اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ لَیْسَ اِلَّا بِرَحْمَتِكَ اَللّٰهُمَّ
 سَوَّلَ اِلَیَّ سَلَامًا وَبَكَرًا لِلّٰهِ كَادَ حَاہُ
 وَكَانَ لَوْ اَنَّہُ لَوَاقِعٌ لَوْ اَنَّہُ لَوَاقِعٌ
 لَوْ اَنَّہُ لَوَاقِعٌ لَوْ اَنَّہُ لَوَاقِعٌ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ اِلَى الْمَقْوُوسِ عَظِیْمِ الْقَبِیْطِ سَلَامًا عِزًّا
 مَنْ اَتْبَعَ الْمَقْدِیَّ - اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِدَعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلَمْتُ لَسَلَمٍ يُّوَدِّكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ
 مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَكَّلْتَ فَعَلَيْكَ مَا يَفْجَعُ الْقَبِیْطُ - يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
 اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نَشْرِكَ بِہٖ شَيْثًا وَلَا نَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ لَوَّوْا فَقُولُوْا
 اشْهَدُوْا اَبَا نَا مُسْلِمُوْنَ ۝ نَامٌ بَارِكُ كَ بَعْضِ الْفَاظِ اَسْ كَ كَ بَعْضِ الْفَاظِ اَسْ كَ كَ بَعْضِ الْفَاظِ اَسْ كَ كَ
 رَوَاہُ ہرے ہرے الفاظ میں سیر تغیر ہو جانا مستبعد نہیں۔

ماخوذ از بلاغ مبین مکاتیب سید المرسلین

حیری یا قدیم کوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ واضح رہے کہ یہ اصلاحی خط کوفی نہ تھا جسکو عام طور پر خط کوفی جدید سمجھا جاتا ہے بلکہ محض وہ خط تھا جسکو اہل یمن اور اہل مکہ نے حیرہ والوں سے حاصل کیا تھا، اس عہد اور اس خط تک، نقاط، اعراب، علامات اور اوقاف کا دستور بھی وضع نہیں ہوا تھا اور الف بھی سیدھا نہیں بنا تھا بلکہ نیچے کا حصہ سڑا ہوا تھا اور اسکی شکل یہ تھی 'سا' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آن کے صاحبزادگان حضرت حسن رضہ اور حسین رضہ تک کی تمام تحریریں اسی خط حیری یا کوفی خط میں ہیں، لہذا حیری کو جدید کوفی سمجھنا اور دوسروں کو یہ باور کرانا کہ رسول مقبول، چاروں صحابہ کرام اور حضرت حسن رضہ و حسین رضہ کے فرامین یا نسخہ ہائے قرآن مجید جو آن کے زمانے میں لکھے گئے جدید خط کوفی میں تھے سراسر غلط اور ایک فاش غلطی ہوگی۔

ہمارے اس دعویٰ کا سب سے بڑا ثبوت رسول اکرم کے وہ مقدس فرامین رسالت ہیں جو حضور نے مختلف شاہان وقت کے نام ارسال فرمائے تھے، امتداد زمانہ کے ہاتھوں اس دولت بیش بہا کا بیشتر حصہ تلف ہو چکا ہے، اس وقت صرف دو فرامین پائے جاتے ہیں۔ پہلا فرمان مبارک 'مقوقس، شاہ مصر کے نام' ہے میں بھیجا گیا تھا۔ یہ مصر کے شاہی خزانہ میں محفوظ تھا جسکا عکس مستشرقین یورپ کی وساطت سے اول رسالہ الہلال، مصر میں بعد ازاں بیت المقدس سے عاشقان رسول نے شائع کیا۔ غالباً یہ فرمان اس وقت ترکی کے عجائب خانہ میں دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ دوسرا فرمان ۱۰ھ کا ہے جو سیلمہ کذاب،

والئی یمامہ (فارس) کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا عکس ۱۸۹۶ء میں لندن پکچر میگزین میں شائع ہوا تھا۔ ان فرامین رسالت کے علاوہ حضرت اسام حسن رضی کے رقم کردہ قرآن مجید کے ایک صفحہ کا عکس سالنامہ مجلہ کابل (۱۲۱۱ھ) میں شائع ہوا تھا۔ ان کتب مقدس کی روشنی میں جدید خط کوفی اور 'خط حیری' کا فرق روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔

عربی خطوط : قدیم خطوط کی تاریخ اس جگہ تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور عربی ابجد یا خطوط کا آغاز ہوتا ہے، مشہور مورخ ہشام بن محمد کی روایت کے بموجب عربی خط کا بانی قبیلہ نصر بن کنانہ میں سے تھا، دوسری روایت حمیر بن سبا کو اسکا موجد ٹھہراتی ہے۔ بہر حال یہ سب قبیلہ قریش ہی کے افراد تھے۔

حضرت آدم پر جو ابجد نازل ہوئی تھی، اسکی صحیح تعداد ۲۸ حروف پر مشتمل ہے۔ 'لام الف، ابجد' کا مستقل حرف نہیں ہے۔ یہ چوتھی صدی عیسوی کی ایجاد ہے، رسول اکرم پر دوسری ترتیب میں ۱۴ حروف نازل ہوئے جو جدول (۱) کی پہلی سطر میں دکھائے گئے ہیں۔ ان سب کی شکلیں مختلف ہیں۔ باقی ۱۴ حروف جو دوسری سطر میں درج ہیں وہ باہم مشابہ ہیں۔ اس لحاظ سے عربوں کی ابجد میں کل ۲۸ حروف ہوئے۔

عربی ابجد

۱۴ ۱۳ ۱۲ ۱۱ ۱۰ ۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

ا	ح	ر	س	ص	ط	ع	ق	ک	ل	م	ن	ه	ی	جدول
ب	ت	ث	ج	ح	خ	د	ذ	ز	ض	ظ	غ	ش	ف	

اب مصری ابجد جدول (۲) پر غور کیجئے ، اس میں ۲۲ حروف تھے جو فنیقی ، ارامی ، سطرنجیلی اور حیری میں بھی برقرار رہے۔ علماء قدیم نے ان مفردات کو مخارج حروف کا لحاظ رکھ کر ابجد ، ہوز ، حطی ، کامن ، سعفص قرشت چہہ کلمات یا الفاظ پر تقسیم کر دیا۔ اہل عرب نے ان ۲۲ حروف میں چہہ حروف کا اضافہ کر کے ، 'ثخذ' اور 'ضظغ' ، دو کلمات یا الفاظ اور ایجاد کئے آخر الذکر چہہ حروف (ثخذ ، ضظغ) لسان عرب ہی سے مخصوص ہیں ، دوسری زبانیں بیجز 'مسند سبائی' اور 'مسند حمیری' ان کے مخارج سے قطعی محروم ہیں۔

مصری ابجد جدول (۲)

(۱) ابجد
۳

(۰) ہوز
۳

(۲) حطی
۳

ح	ط	ی
۸	۹	۱۰

ہ	و	ز
۵	۶	۷

ا	ب	ج	د
۱	۲	۳	۴

۲۸

(۶)

قرشت

۴

(۵)

سعفس

۴

(۴)

کامن

۴

جدول

۲

ت	ش	ر	ق	ص	ع	س	ن	ل	م	ک	کل حروف	
۴۰۰	۳۰۰	۲۰۰	۱۰۰	۹۰	۸۰	۷۰	۶۰	۵۰	۴۰	۳۰	۲۰	۲۲

(۸)

ضظغ

۳

(۷)

ثخذ

۳

کل تعداد

۲۲	غ	ظ	ض	ذ	خ	ث	عربی ایجاد
۶	۱۰۰۰	۹۰۰	۸۰۰	۷۰۰	۶۰۰	۵۰۰	
۲۸							

اس مقام پر یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عربوں نے ان ۲۸ حروف کی تخصیص کیوں قائم کی۔ بقول علامہ ابن ندیم عربوں نے یہ ۲۸ حروف منازل قمر کے حساب سے وضع کئے تھے، اسی طرح عرب کا کوئی کلمہ سات حروف سے زیادہ نہیں ہے؛ یہ نسبت بھی انہوں نے سات سیاروں (پروین یا ثریا) کی مناسبت سے رکھی ہے، عربوں کے حروف الزوائد بھی زیادہ سے زیادہ ۱۲ ہیں اور یہ تعداد بروج فلکی کے مطابق ہے۔ اصل اعراب (زیر، زبر، یمش) صرف تین ہیں کیونکہ حرکت طبعی بھی تین ہی ہیں، یعنی حرکت نار، حرکت زمین اور حرکت فلک۔ نقاط کی ایجاد کا سہرا بھی

عربوں ہی کے سرھے اور یہ حضرت علی رض کے عہد کی یاد گار ہے۔ پہلے یہ نقاط کچھ خوشنما نہ تھے۔ ابن مقلہ نے مدور کر کے ان میں بھی حسن پیدا کر دیا اور حروف قدیم کی ترتیب ابجد ہوز وغیرہ کو بھی یکسر بدل کر ہم شکل حروف برابر برابر لکھے۔

خطوط مرموزات : انہی مفرد حروف کی اساس پر بلحاظ ابجد ہوز وغیرہ ساہران مرموزات نے خفیہ تحریروں اور تاریخی سادے نکالنے کا فن ایجاد کیا، یعنی حروف ابجد کی قیمت ایک سے ہزار تک کے اعداد میں مقرر کر دی جیسا کہ جدول ۲ سے ظاہر ہے پھر مختلف قواعد اور طرز تحریر کے مطابق ان خطوط کے مختلف نام مقرر کئے جو حسب ذیل ہیں۔

خط ہندسہ : (خط اشارہ، خط رمز، خط کنایہ، خط مرموزہ) ایک ہی خط کے مختلف نام ہیں۔ اس خط یا خطوط سے مراد وہ تحریر ہے جس میں حقیقی اور اصلی اشکال حروف کو بعض مخصوص علامات، مقررہ نشانات یا اعداد میں اسطرح ظاہر کیا جائے کہ بجز واقف اشخاص کے کوئی دوسرا نہ سمجھ سکے، اس کی تحریر کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ایک خط صفحہ کے عرض میں کھینچا جانا ہے پھر مطلوبہ الفاظ کے حروف کو اعداد ابجد کے مطابق اس لکیر کے اوپر اور نیچے مقررہ قواعد کے ماتحت لکھتے ہیں۔ چونکہ اس تحریر کے کئی قاعدے اور انکی شرح بڑی طول طویل ہے اسلئے ہم اسکی صرف ایک ہی مثال پراکتفا کریں گے۔ مثال : غضنفر علی کو اسطرح لکھیں گے۔

قاعدہ تاریخی مادہ :

مثلاً "یوسف" (ی - و - س - ف) کی قیمت ۱۵۶ ہے

۱۰ ۶ ۶۰ ۸۰

یا ایک بچی جو ۱۳۵۴ھ میں پیدا ہوئی ہو اسکا ایک نہایت

پیارا تاریخی نام 'درنظر' (د ، ر ، ن ، ظ ، ر) ہو سکتا ہے۔

۳ ۲۰۰ ۵۰ ۹۰۰ ۲۰۰

اسی ضمن میں ہندی زبان کے مشہور شاعر کبیر کے ایک دوہے کی مثال بھی خالی از لطف نہ ہوگی۔ کبیر کے دوہوں کو دنیائے ادب میں ایک خاص مقام اور درجہ حاصل ہے۔ کبیر کے سنہ سے حضرت محمد ص کے مقدس نام کی عالمگیر وسعت کا اندازہ اور حضرت محمد ص کے ساتھ کبیر کی عقیدت ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے ،

نام لو ہر و ستو کا چو گن کر لو وائے
دو ملا یو پچگن کر لو بیس بھاگ لگائے
بچے کو اب تم نو گن کر لو اور دیو دو ملائے
کہت کبیر ہر و ستو میں نام محمد ص پائے

ترجمہ :

دنیا کی کسی شے کا نام لو ، اس کے اعداد کو چو گنا کر لو ، اس میں اول دو جمع کرو پھر آن کو پانچ گنا کر لو ، اب بیس سے تقسیم کر دو ، باقی کو پھر نو گنا کر لو اور آخر میں دو ملا دو ، ہمیشہ نام محمد ص پاؤ گے۔

مختصر فارمولہ :

$$\text{کسی نام کا عدد} \times ۴ + ۲ \times ۵ \div ۲۰$$

$$\text{محمد ص} = ۹۲ = ۲ + ۹ \times \text{باقی اعداد}$$

واضح رہے کہ محمد ص کے حروف کی قیمت بحساب ابجد ۹۲ برآمد ہوتی ہے۔

مثال :

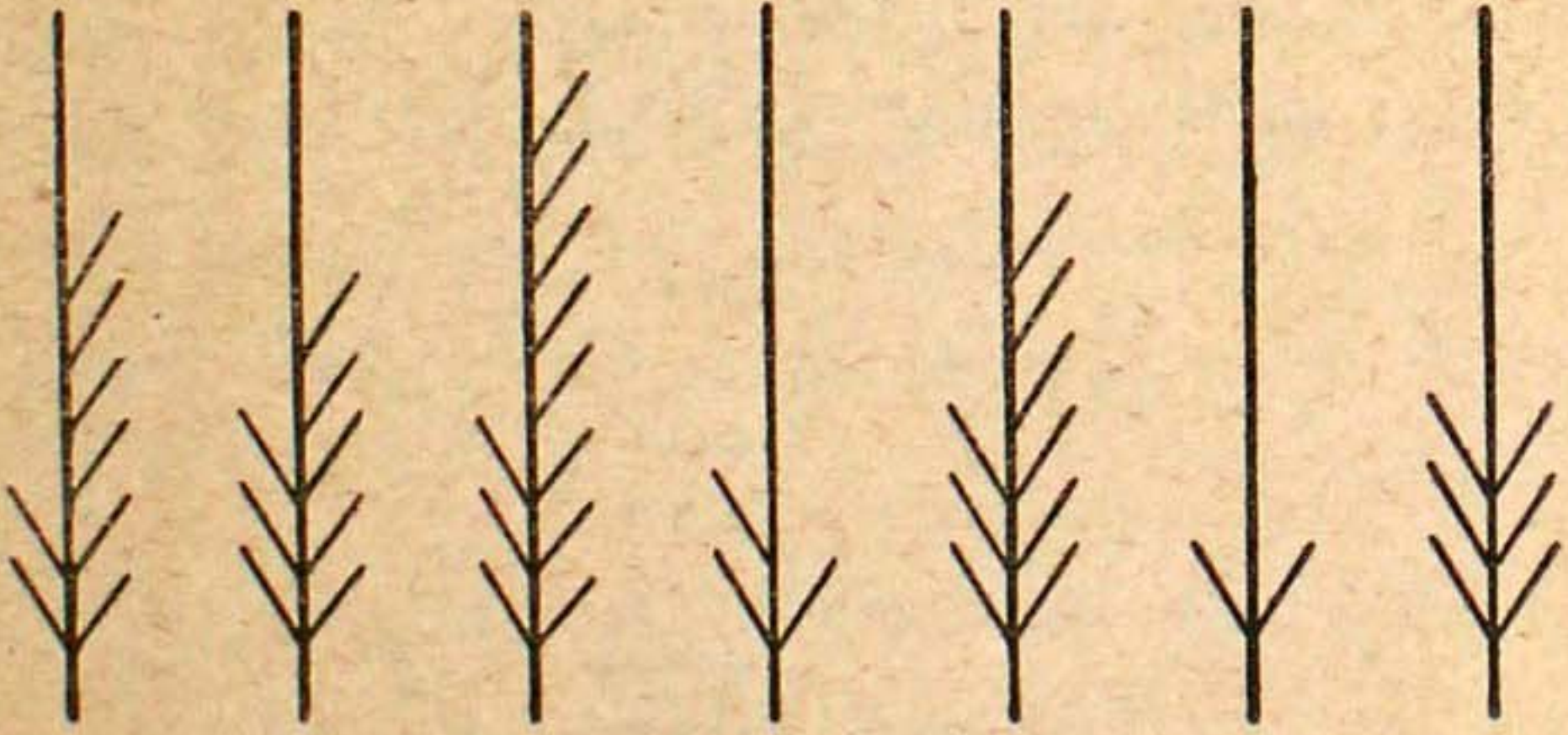
فرض کیجئے لفظ 'آم' ہے۔ آم ($\frac{۱}{۱}$ ' $\frac{۴}{۳۰}$) کے کل

اعداد ۳۱ ہیں فارمولہ کے مطابق اس کا حل یہ ہے :

$$\begin{array}{r}
 ۳۱ \\
 \underline{۳} \\
 ۱۶۴ \\
 \underline{۲} \\
 ۱۶۶ \\
 \underline{۵} \\
 ۲۰ \overline{) ۸۳۰} \quad (۳۱ \\
 \underline{۸۲۰} \\
 ۱۰ \\
 \underline{۹} \\
 ۹۰ \\
 \underline{۲} \\
 ۹۲
 \end{array}$$

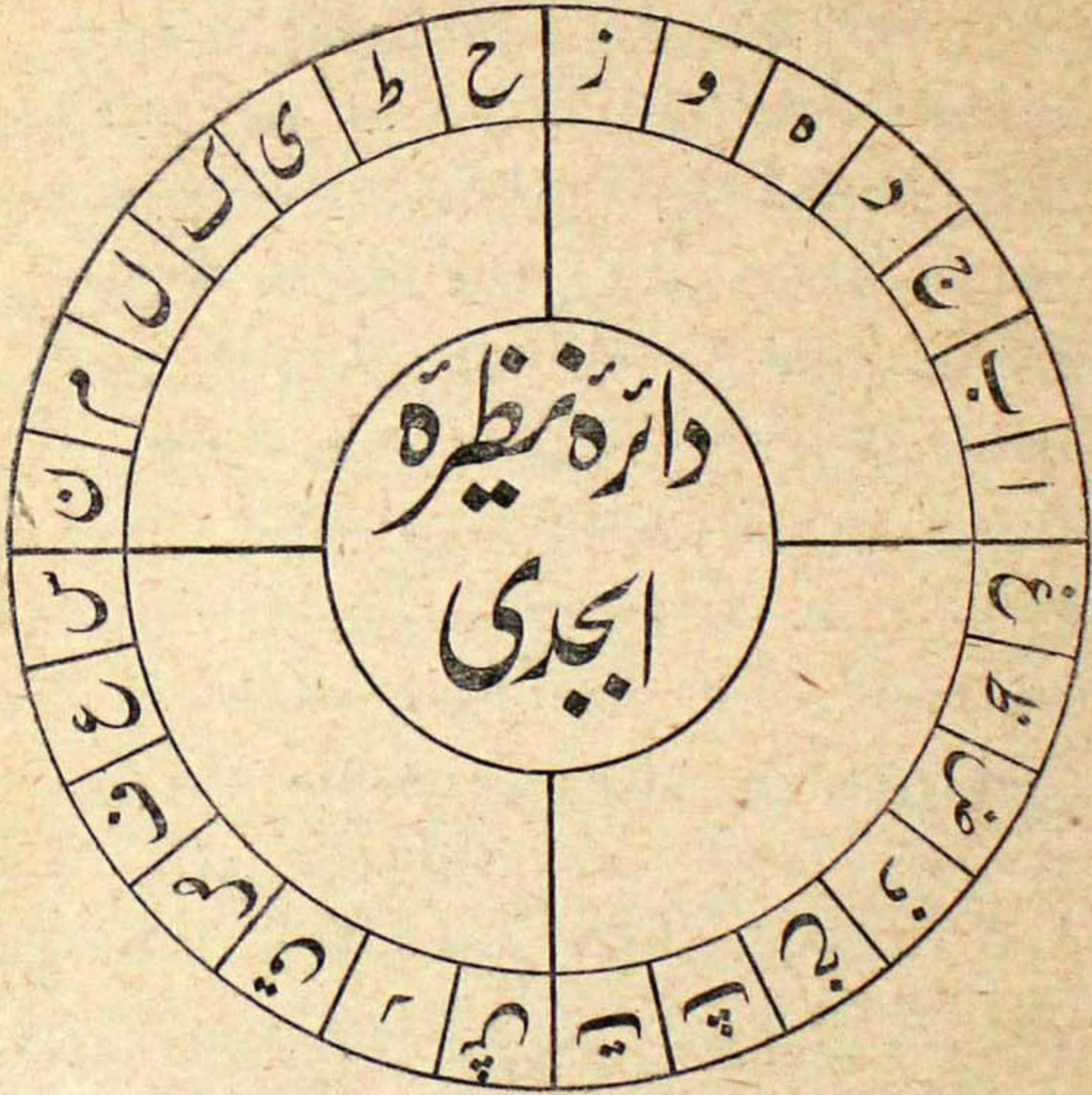
محمد ص =

خط سرو : (۱) مزکورہ بالا خطوط کی طرز کا ایک خط جو باریک لکیروں سے بولوں کے مقررہ اشاروں میں سرو کے درخت کی شکل میں لکھا جاتا ہے ، یعنی ابجد ہوز وغیرہ کے مجموعوں کے مطابق کھڑے خط کے دائیں بائیں آڑی لکیریں مقررہ تعداد میں کھینچی جاتی ہیں ، اس کے ایک قاعدے کی مثال یہ ہے :
 ”یارب غفور، اس طرح لکھا جائیگا :-“



خط نظیرہ : یہ بھی خط اشارہ کی ایک قسم ہے جو اپنے موجد کے نام پر موسوم ہے چنانچہ دائرہ نظیرہ ابجد مشہور ہے۔ اس دائرہ میں حروف ابجد ، ہوز وغیرہ ایک دوہرے دائرے کی شکل میں اس کے خانوں میں لکھے جاتے ہیں جنکو حروف اشارہ کی مدد سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

۱۔ ماخوذ از فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ، جلد چہارم



مثلاً لفظ 'نوخع' ہے۔ نوخع کے حروف ن، و، خ، ع کے مقابل دائرے میں دوسرے حروف غ، ر، ی، ب آتے ہیں، اس نوخع کا مطلب 'غریب' ہے۔

غرض اسی انداز پر خفیہ تحریروں کی اور بھی بہت سی قسمیں اور ترکیبیں ہیں لیکن چونکہ ان کا فن خوش نویسی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ہم اس موضوع کو کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں، اس جملہ معترضہ کے بعد ہم اپنے اصل مباحث پر آتے ہیں۔

خاکہ: ماخوذ از فرهنگ اصطلاحات پیشہ وران جلد چہارم۔

عربوں میں رسم الخط کی ترقی کے اسباب میں سب سے بڑا سبب وحی الہی ہے جس کے ذریعہ قرآن مجید نازل ہوا۔ حضرت ص کو کتابت وحی کے لئے کاتبوں کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے رسم الخط کی طرف توجہ فرمائی۔ غزوہ بدر میں ستر . ۷ قیدی ایسے ہاتھ آئے جو نوشت و خواند سے واقف تھے۔ آپ نے اپنی حکمت سے ہر قیدی کا فدیہ آزادی یہ مقرر کیا کہ وہ دس آدمیوں کو کتابت کی تعلیم دے، اس طرح ایک قلیل مدت میں بیس وقت . . ۷ نفوس کتابت سے واقف ہو گئے اور اور پہلا دارالکتابت مدینہ منورہ ہوا۔ اس وقت مدینہ کے مقابلہ میں مکہ معظمہ میں صرف ۱۶ آدمی ایسے تھے جو لکھنا جانتے تھے۔ بعد ازاں جب خلافت راشدہ کا آغاز اور اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تدریس و تدوین میں ترقی ہوئی تو ایک ربع صدی ہی میں سیکڑوں کاتب اور منشی پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی حفاظت اور تبلیغ کے لئے چند نسخے لکھے گئے جن میں حضرت عثمان رض اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ پیش پیش تھے۔ اس وقت تک قرآن مجید کی کتابت میں نقاط اور اعراب کا رواج نہیں تھا۔ نقاط کی ایجاد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں زیاد حاکم بصرہ کے ایما پر ہوئی۔ ان نقاط کے موجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ندیم خاص ابوالاسود تھے۔ ان نقاط نے پوری ایک صدی تک اعراب کا کام دیا۔ ابوالاسود کا دوسرا کارنامہ عربی نحو کے ابتدائی قواعد کی ترتیب اور تدوین تھا۔ ان کی وفات ۲۹ھ میں ہوئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا رسم الخط میں بھی مسلسل ترمیم و اصلاح ہوتی رہی پہلے حیرہ علم خط کا مرکز تھا مگر خلافت بنی امیہ اور عباسیہ میں مدینہ اور مکہ کے علاوہ بصرہ اور کوفہ بھی خط کا مرکز بن گئے۔ کوفہ کو ایسی تاریخی شہرت حاصل ہوئی کہ یہ شہر نہ صرف فن کتابت کا معلم ہوا بلکہ اکثر علوم عربی کا مبداء بن گیا۔ چنانچہ لغت کی پہلی کتابت بھی جو خلیل بصری کی تصنیف تھی، کوفہ ہی میں ہوئی۔ جدید خط کوفی ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

خط کوفی جدید : اس کا آغاز خلیل بن احمد نحوی موجد علم عروض کے زمانے سے ہوا۔ یہ عہد عباسی کا ایک نامور فاضل تھا۔ اس نے قدیم خط کی اصلاح کی اور موجودہ اعراب جاری کئے۔ ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ اسی سال خلیفہ ہارو الرشید عباسی تخت نشین ہوا۔ خلیل کے بعد علی بن حمزہ کسائی نحوی نے خلیل کے مہذب خط پر ایک اور غائر نظر ڈالی۔ اس میں خوشنویسی سے زیادہ مصورانہ شان اور نقاط میں بانگین پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اس خط کو قبول عام کی سند مل گئی اور اس خط کا نام 'خط کوفی' ہوا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ اب مصاحف کی کتابت اور دفتر انشاء کی مراسلت بھی اسی خط میں ہونے لگی۔ کسائی نے ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ اسی عہد کو اس خط کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔

عہد ہارون الرشید سے معتصم باللہ عباسی تک متعدد نامور خطاط ہوئے۔ ان خطاطوں کے تذکروں سے بلا اختلاف یہ ثابت ہے کہ خط نسخ کے جس قدر بہترین نمونے دور حاضر میں ملنے ہیں، ان سب کی اصل یہی خط کوفی ہے۔ خط کوفی سے عہد ہارون الرشید تک بارہ قلم (جدول نمبر ۱) ایجاد ہو چکے تھے جن کی کتابت ہر قلم کی معنوی نسبت کے مطابق اسی خط میں ہوتی تھی۔ 'تحقیقات ماہر، میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ یہ بارہ قلم تیسری صدی ہجری تک رائج رہے۔ ان بارہ قلموں پر عہد ہارون الرشید کے بعد آٹھ قلم (جدول نمبر ۲) کا اور اضافہ ہوا۔ اس طرح خط کوفی سے جملہ بیس قلم نکلے۔ ان بیس قلموں کے ساتھ ساتھ چھ قلم (جدول نمبر ۳) اور جاری تھے جو خوشنویسی اور کتابت کلام مجید کے لئے مخصوص تھے۔ خلیفہ کے عہد میں گو ان تمام خطوط کے کاتب موجود تھے لیکن ان کے موجد اور معلم کون تھے، اس باب میں تاریخ تقریباً خاموش ہے۔ جب ابن مقلہ نے اپنے چھ خط (جدول نمبر ۴) ایجاد کئے تو یہ تمام خط یکسر متروک اور فنا ہو گئے۔

خط نسخ: فی الاصل خط کوفی کا مصلح اعظم و اول ابو علی محمد بن علی بن حسن بن عبد اللہ ملقب بہ ابن مقلہ تھا۔ ۲۷۲ھ میں پیدا ہوا۔ خلیفہ القاهر باللہ عباسی کا وزیر تھا۔ لیکن بعض امور سیاسی میں اختلاف کے باعث ابن مقلہ نے خلیفہ کے خلاف سازش کی، اس وقت تو وہ کسی نہ کسی طرح اس سازش کی پاداش سے بچ گیا، کیونکہ سازش کے ماتحت خلیفہ معزول ہو گیا تھا۔ لیکن جب اس کا بیٹا ابوالعباس راضی باللہ خلیفہ

ہوا اور سازش عیاں ہو گئی تو قید ہوا۔ اس کا دایاں ہاتھ
 اور زبان کاٹ دی گئی اور اسی حالت میں بعمر ۶۰ سال
 ۵۳۲ھ میں وفات پائی۔ ابن مقلہ کا انتہائی کمال یہ تھا کہ
 جب دایاں ہاتھ کاٹ گیا تو کہنی میں کھپچی باندھ کر لکھتا
 اور لاجواب لکھتا۔ اس نے ایک خاص روشنائی ایجاد کی تھی
 جس نے اس کے خط کو اور بھی روشن کر دیا تھا۔ اس عدیم النظیر
 خطاط نے خط کوفی اور معقلی کے لطیف امتزاج سے اول خط نسخ
 کے علاوہ پانچ اور قلم (جدول نمبر ۴) جاری کئے۔ ان پانچ
 خطوں کے بعد چھ قلم (جدول نمبر ۵) اور نکلے مگر ان کو نئے
 قلم کہنا درست نہیں۔ دراصل یہ سب نسخ کی شاخیں ہیں
 جو ابن مقلہ اور دوسرے خطاطوں کی اصلاح کردہ ہیں۔ دوسرے
 اصلاح کرنے والوں میں سے ایک مشہور و معروف خطاط ابوالحسن
 علی ابن ہلال بواب (دربان) تھا۔ ابن بواب، ابن مقلہ کی
 وفات سے تقریباً ۸۴ سال بعد پیدا ہوا اور آسمان
 شہرت پر بدر کامل ہو کر چمکا کیونکہ خط نسخ
 کی تہذیب اور حسن و جمال کا سہرا آخر میں ابن بواب
 کے سر رہا۔ یہ $\frac{۵۴۱۳}{۶۱۰۳۱}$ یا ۵۴۲۳ھ میں بمقام بغداد فوت ہوا۔
 ابن بواب کے بعد نسخ کے باکمالوں میں تین یاقوت مشہور ہوئے۔
یاقوت اول: امین الدولہ ابوالزر یاقوت بن عبداللہ موصلی
 یہ شاہ سلجوقی کا درباری تھا، اس لئے یاقوت الملکی مشہور ہوا
 ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں بمقام موصل وفات پائی۔

یاقوت دوم : یاقوت بن عبداللہ الرومی الحموی ہوا اس نے
۵۶۳۶ھ میں وفات پائی ۔

یاقوت سوم : یاقوت بن یاقوت بن عبداللہ رومی المستعصمی۔
یہ باکمال ابوالمجد خواجہ عمادالدین رومی کے نام سے بھی
مشہور تھا ۔ خط نسخ کا آخری امام یہی ہوا ہے جس پر اس
فن کا خاتمہ ہو گیا $\frac{۵۶۹۸}{۶۱۲۹۹}$ میں وفات پائی ۔ اس یاقوت کے

ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید اب تک نواب زادہ سعید الظفر
خان بہادر، بھوپال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ نواب موصوف
نے اسے پیرزادگان مارہرہ شریف کے کتب خانے سے حاصل کیا تھا۔

ایرانی و ترکی خطوط : آغاز کتابت سے خط نسخ تک کی
تاریخ تمام ہوئی ، اب ہم ایران یا گلستان عجم کے باب
خطوط میں داخل ہوتے ہیں ، یہ سیر بھی بڑی ہی دلچسپ ہے۔

ایران کی تاریخ دراصل کیومرث سے شروع ہوتی ہے جسے
ایرانی یا رز دشتی اپنے ملک کا باوا آدم تصور کرتے ہیں ،
زردشت کی مذہبی کتاب 'اوستاء' میں ایران کا تلفظ 'اے ریانہ'
ہے یہ ایرڈبندز کا ملک تھا جسے سنسکرت کے قدیم لب ولہجہ
میں 'آریا' کہا جاتا ہے ، اہل عرب کو اپنے علوم اور زباں دانی
کا بڑا پندار تھا اس لئے وہ ایران کو عجم کہا کرتے تھے ،
ایرانی مورخین نے تاریخ ایران کو آٹھ ادوار پر تقسیم کیا ہے۔ لیکن
ہم بلحاظ موضوع صرف چھ متعلقہ ادوار کو پیش کریں گے ۔

۱۔ آشوری دور : جرمن محقق اسپیگل کی تحقیق کے مطابق مسیح سے ایک ہزار برس قبل ایران میں زبان قدیم فارسی اور پیکانی خط رائج تھا جو مصری اور چینی خط سے مشابہ ہونے کے ساتھ ساتھ مصور بھی تھا۔

۲۔ میدوی دور : (حضرت مسیح سے ۷۰۰ برس قبل) اس میں وہی قدیم زبان فارسی تھی، جو اب مفقود ہو چکی ہے اور خط پیکانی تھا۔

۳۔ قدیم ایرانی دور : (۵۰۹ سے ۳۳۰ ق۔ م تک) اس عہد کا آخری بادشاہ دارائے اعظم تھا۔ جس کو سکندر اعظم یونانی نے شکست دی اور ایران کو تاخت و تاراج کیا۔ چنانچہ کوہ بے ستون اور نقش رستم کے کتببات میں ان کے کار نامے درج ہیں جو قریب قریب پیکانی خط میں ہیں۔ زبان قدیم فارسی یا اوستائی تھی۔

۴۔ طوائف الملوکی دور : (۳۳۰ ق م سے ۲۲۶ ق م تک) اس عہد کی بدنظمی کی کیفیت شاہنامہ فردوسی میں ”اشکانیاں“ کے عنوان کے تحت زبان فارسی میں درج ہے۔ قدیم کتابت بدستور قائم رہی۔

۵۔ ساسانی دور : (۲۲۶ تا ۶۵۲ ق م) ساسانی حکومت کا بانی اردشیر تھا۔ جس نے زردشتی مذہب کو دوبارہ حیات بخشی۔ بہرام، نوشیروان، خسرو پرویز وغیرہ نامور بادشاہ

ہوئے۔ آخری بادشاہ یزدگرد $\frac{۵۳۱}{۶۵۲}$ میں قتل ہوا۔ زبان متوسط

فارسی ہو گئی جو اُس وقت عرف عام میں پہلووی کہلاتی تھی۔
خط بھی پہلووی ہو گیا لیکن اس کا ماخذ شکستہ شکل میں
مسماری ہی تھا۔

۶۔ اسلامی دور - (آغاز از عہد خلافت فاروقی) حلقہ
بگوش اسلام ہو جانے کے بعد چونکہ مذہبی احکام کی ادائیگی
کے لئے قرآن کریم کا لکھنا پڑھنا اور سمجھنا لازم ہو گیا تھا،
اس لئے ایرانی نوشت و خواند میں عربی کا عمل و دخل بڑی
تیزی سے شروع ہوا، اس کے باوجود آئینہ ایک صدی تک
پہلووی خط دوش بدوش جاری رہا۔ اس کا ثبوت رودکی کے اشعار
سے ملتا ہے۔

آشوری دور سے دور ساسانیوں تک ایران کا خط مسماری
تھا، اس کے بعد پہلووی ہوا۔ محققین عرب کے بقول ایران
میں قبل اسلام سات قلم (جدول نمبر ۱) جاری تھے اور ان
خطوط کا ضمیمہ 'زوارشن' تھا یعنی بوقت ضرورت ان خطوط
میں مخصوص ہجوں سے کام لیا جاتا تھا۔ خراسان مامون الرشید
کے زمانہ ہی میں علم و فن کا مرکز بن چکا تھا۔ مامون کی
وفات کے بعد خاندان طاہریہ - دیالمہ - سلاجقہ - سامانیہ اور
غزنویہ میں اور بھی قابل رشک ترقی ہوئی، یہاں تک کہ
ایرانیوں کو تصنیف و تالیف میں عربوں پر سبقت حاصل ہو گئی۔
علاوہ ازیں بغداد کے اصلاح یافتہ عربی خطوط (جدول نمبر ۴)
جن کو ابن بواب اور یاقوت مستعصمی نے مہذب اور مکلف کیا
تھا، وہ سب کے سب ایران میں جاری ہو گئے۔ اس کے بعد
حسن بن حسین بن علی فارسی نے ۷۰۰ھ (عہد شاہان دیالمہ)

میں نسخ ، رقاع ، ثلث اور توفیق کے اختلاط سے ایک جدید ایرانی قلم 'تعلیق' جاری کیا ، نیز محقق سے ایک اور قلم نکلا جو 'مطلق' کہلایا ۔

دشتی - دیوانی - فارسی : ایران کے پہلو بہ پہلو دولت عثمانیہ (ٹرکی) نے بھی ان ایرانی قلموں کو خوش آمدید کہا ۔ چنانچہ ان کے رواج پانے کے بعد اہل ٹرکی نے ان خطوط کی روشنی میں دشتی ، دیوانی اور فارسی تین قلم ایجاد کئے ، نیز ثلث اور رقاع کو بھی جاری رکھا ۔

قلم تعلیق کے اساتذہ میں نجم الدین ابوبکر راوندی ، خواجہ تاج سلیمانی اور میر عبدالحمی ہوئے ۔ آخر الزکر ابوسعید مرزا گورگانی کے دفتر انشاء میں افسر تھے ۔ اور متاخرین میں اشرف خان خوش نویس دربار اکبری تھا ۔

نستعلیق : قدرت نے اہل عجم کی سرشت میں حسن و اجتہاد کا مادہ بڑی فیاضی کے ساتھ ودیعت کیا ہے چنانچہ ایرانی خطوط سے بھی ان کی حسن پرستی اور جدت پسندی کا اظہار ہوتا ہے ۔ انہوں نے دیکھا کہ خط نسخ کے دائرے بالکل یکساں اور حروف ناہموار ہیں یعنی دائرے گول ہونے کے بجائے ان کا نیچلا سرا کچھ اس طرح چپٹا ہو جاتا ہے کہ زاویے نمودار ہونے لگتے ہیں ، لہذا انہوں نے نسخی حروف میں اپنی فطری صلاحیت سے کام لیکر نقاشی اور مصوری کی شان پیدا کی ، یعنی دائرے گول بنائے ، حروف کی نوکیں ، گردنیں اور زیرین حصہ باریک کر دیا ۔ اس کا نام انہوں نے

’نستعلیق‘ رکھا۔ ذرا اس ندرت حسن و خیال کو بھی دیکھئے کہ قلم کی پرکاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے لفظی ترکیب میں بھی کس قدر نفاست سے کام لیا ہے کہ نسخ اور تعلیق کے درمیان جو (خ) کی خلیج حائل تھی اسے دور کر کے باقیات میں ایک جامع اور دلربا نستعلیق باقی رکھا جس میں بلاشبہ تمام قلموں کی شان اور باریکیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

شکستہ : نستعلیق اگرچہ سب سے حسین اور جامع خط تھا لیکن اس کی کتابت دیر طلب اور صبر آزما تھی، اس لئے تقریباً ۱۱۰۰ھ میں مرتضیٰ قلی شالمو حاکم ہرات نے عام دفتری مراسلت کے لئے خط شکستہ جاری کیا۔

شفیعہ : آقا کی تقلید اور پیروی میں مرتضیٰ قلی کے میر منشی ’شفیعہ‘ نے اپنے آقا کے خط شکستہ میں ایک حسن خاص پیدا کر کے اس کا نام شفیعہ رکھا جو اب تک حسب سابق مشہور ہے۔

دراصل نستعلیق کتابی خط ہے جو ایران اور ہند و پاکستان وغیرہ میں جاری ہے اور مراسلت کا قلم شفیعہ ہے۔ نستعلیق کے حسن قبول اور ٹکسالی خط ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ لفظ نستعلیق سے کئی محاورات ایجاد ہوئے جو ہمارے ادب میں رائج اور زبان زدعوام ہیں مثلاً فلان شخص بڑا ہی نستعلیق ہے یعنی بہ اعتبار اخلاق و عادات نہایت مہذب انسان ہے۔

کتابت کی تاریخ بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ اول نستعلیق کے مشہور اساتذہ ایران کا تذکرہ کیا جائے،

بعد ازاں عہد دولت مغلیہ پر ایک نظر ڈالی جائے جہاں یہ خط آخری بار پروان چڑھا اور اپنی پوری عمر کو پہونچا یعنی لاہور، اکبر آباد (آگرہ) دہلی اور لکھنؤ میں فن خطاطی کے چار مدرسے قائم ہوئے جہاں سے متعدد ماہرین فن خطاطی اور نامور شیریں قلم اور جواہر رقم پیدا ہوئے۔ انہی کی بدولت یہ فن لطیف آج تک زندہ اور تاب دار ہے۔ ایران میں نستعلیق کے حسب ذیل پانچ اسام ہوئے۔

خواجہ میر علی علوی تبریزی : ان کو خط نستعلیق

کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہ عہد تیمور یعنی (۱۷۷۷ء) کے نامور
۱۸۰۱ء

خطاط اور خوش فکر و خوش گو شاعر تھے، ابوالفضل اپنے دیباچہ 'مرقع بادشاہی' (البہم قطعات خوش نویسان ہند و ایران مرتبہ بادشاہ جہانگیر) میں لکھتا ہے کہ اس نے امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیقی وصلیاں دیکھی تھیں۔ یہ شہادت یقیناً معتبر ہے اس لحاظ سے نستعلیق کا موجد کوئی اور تھا۔ وہ کون تھا؟ یہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ تاہم میر علی نستعلیق کے مصلح اول ضرور تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں مولانا غلام محمد دہلوی کے، تذکرہ خوش نویساں، سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گو میر علی نستعلیق کے موجد نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس قدم کے قواعد مقرر کئے اور اس کے مطابق نستعلیق کی نوک پلک میں حسن اور نزاکت پیدا کی۔ میر علی کے مقلدین میں ایرانی، ہندی اور ترکی تینوں شامل ہیں۔ ان کی وصلیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ایران اور انڈیا آفس

لندن کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ یہ علی ہروی، ملا علی شیرازی اور میر علی خراسانی ان کے ہم نام و ہم عصر خطاطوں کے علاوہ سلطان علی مشہدی ان کے ناسور شاگرد تھے۔

سلطان علی مشہدی: یہ نستعلیق کے امام دوم تھے۔ سلطان حسین تیموری کے عہد میں ہوئے۔ سلطان نے ان کو 'قبلتہ الکتاب' کا خطاب دیا تھا۔ متعدد کتابیں، وصلیاں اور فن خطاطی پر ایک جامع رسالہ یادگار چھوڑا 'تاریخ تیموری' انہی کی تحریر کردہ ہے جس کی تصاویر مشہور مصور بہزاد نے تخلیق کی تھیں۔ بابر نے بھی اپنی تزک میں ان کے کمالات بیان کئے ہیں۔

سلطان علی کے شاگرد یہ ہیں :- سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور، علاءالدین محمد ہروی، مولانا عبداللہ ہروی، زین الدین محمود، عبدی نیشاپوری، محمد قاسم شادی شاہ، اور میر علی الکاتب ہروی، ان میں آخری زیادہ ممتاز ہیں۔

میر علی الکاتب ہروی: یہ نستعلیق کے امام سوم کہلاتے ہیں۔ خطاطی کے ساتھ شاعری میں بھی کمال حاصل تھا۔ مجنوں تخلص تھا۔ فن خطاطی پر دو رسالے نظم کئے جو مشہور ہیں۔ ۹۰۹ھ میں ایک رسالہ رسم الخط پر لکھ کر سلطان مظفر کے نام معنون کیا۔ یہ رسالہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ جب سلطان عبدالعزیز بخارا کے درباری ہوئے تو سلطان کی فرمائش پر دو کتابیں 'گلستان سعدی' اور 'مطلع الانوار' امیر خسرو رقم کیں۔ 'گلستان' پیرس کی لائبریری میں اور 'مطلع الانوار' خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

ابوالفضل نے بھی ان کو نستعلیق کا استاد تسلیم کیا ہے۔
'مرقع بادشاہی' (جہانگیر) میں بھی ان کی چند وصلیاں شامل
ہیں۔ زیادہ معتبر روایت کے بموجب ۱۵۷۱ھ میں وفات پائی۔

میر علی کے بعد نستعلیق کے مشہور خطاطوں میں ملا
محمد حسین تبریزی، میر سید احمد مشہدی، ملا حسن علی
مشہدی، ملا شاہ محمد نیشا پوری اور مرزا ابراہیم اصفہانی
ہوئے جن کا مرتبہ جدا جدا ہے۔

میر عماد الحسینی قزوینی : نستعلیق کے امام چہارم ہیں۔
ان کو بابا شاہ اصفہانی سے تلمذ حاصل تھا اور ملا محمد حسین
تبریزی اور سلطان علی مشہدی کے مقلد تھے۔ شاہ عباس
صفوی کے دربار سے متعلق تھے۔ ان کے متعلق ایک روایت
اس طرح مشہور ہے کہ جب ان سے شاہ عباس نے 'شاہ نامہ فردوسی'
نقل کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے اپنے لئے ایک آراستہ
باغ مخصوص کرایا جس کے حوض میں شاہی خرچ سے عرق
گلاب اور کیوڑہ بھرا گیا۔ یہ وقتاً فوقتاً تبدیل بھی ہوتا تھا،
اس اہتمام اور تکلف کے ساتھ میر عماد نے تین سال کی مدت
میں صرف چھ جزو مکمل کئے۔ حاسد وزراء اور امراء عماد کی
تاک میں تھے، انہوں نے موقع پا کر شاہ کو بھڑکایا اور کہا
کہ تین سال میں چھ لاکھ روپے کی رقم خطیر خرچ ہو چکی ہے
اور ابھی صرف چھ جزو لکھے گئے ہیں۔ حواشی پر ابھی
طلائی کام بھی نامکمل ہے۔ بادشاہ ان خوشامدیوں کی باتوں
میں آ کر غضب ناک ہوا اور میر عماد کو حکم دیا کہ
نصف یوم میں چھ لاکھ روپیہ واپس خزانہ شاہی میں داخل

کیا جائے۔ میر عماد اس اچانک عتاب شاہی سے متاسف تو ضرور ہوئے لیکن اسی وقت چند نقیبوں کے ہمراہ ایک سواری میں بیٹھ کر شہر گئے۔ نقیبوں نے صدا بلند کی 'اسروز تحریر عماد ارزاں است، چند ہی گھنٹوں میں وہ چہہ جزو مقراض زدہ ہو کر ایک ایک دو دو سطروں کی شکل میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ مقررہ وقت سے قبل چھ لاکھ روپیہ خزانہ شاہی میں جمع ہو گیا۔ بادشاہ یہ اطلاع پا کر اور بھی برا فروختہ ہوا۔ بعد میں اپنی بدنامی اور رسوائی کے خوف سے اس نے میر عماد کو ایک حمام میں قتل کرادیا۔ اس وقت اسکی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ سال وفات ۱۰۲۴ھ ۱۶۱۵ء ہے جو عہد جہانگیر تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے جب یہ درد ناک واقعہ سنا تو رو پڑا اور کہا کہ اگر شاہ عباس اسکو قتل کرنیکی بجائے میرے پاس بھیج دیتا تو میں شاہ کو عماد کے ہم وزن موتی بھیج دیتا۔

آقا عبدالرشید ویلمی : میر عماد کے حقیقی بھانجے ، داماد اور شاگرد تھے ، آقا رشید کے نام سے مشہور ہوئے۔ اپنے فن میں اتنے کامل تھے کہ استاد و شاگرد کی وصلیوں میں امتیاز دشوار تھا۔ میر عماد کے واقعہ شہادت اور اپنے قتل کے اندیشہ سے ایران سے راہ فرار اختیار کی ہندوستان تک پورا سفر گھوڑے پر کیا۔ بحالت تباہ شاہجہاں کے حضور میں اکبر آباد (آگرہ ، بھارت) آئے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ اول لاہور پہونچے اور کچھ مدت وہیں قیام کیا۔ اس اثنا میں وہاں آن کے متعدد شاگرد ہوئے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو نستعلیق کا پہلا مرکز لاہور کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

وہی ہوتا ہے
میں نے اس کا
کلام لکھا
میں نے اس کا
کلام لکھا
میں نے اس کا
کلام لکھا

وصالی : میر عماد (عہد شاہ جہانزی)

آگرے پہونچتے پہونچتے لباس وجامہ زبوں اور تار تار ہو چکا
 تھا اور یہ زبوں حالی باریابی میں مانع ہو رہی تھی۔ نذر
 شاہی کے لئے بھی کچھہ درکار تھا۔ آقا رشید نے قدرے
 غور و تامل کے بعد قلم و دوات طلب کی اور ایک قطعہ کاغذ
 پر یہ اشعار لکھے۔

آیا خجستہ خصالی کہ ساکنان فلک
 بر آستان تو دارند میل دربانی
 چہ حاجت است کہ گوئیم حال خستہ خود
 کہ حال خستہ دلاں را تو خوب می دانی

یہ پرزہ کاغذ آقا رشید کے حق میں سیچ سیچ کاغذی پیرہن
 ثابت ہوا، جب یہ پیکر تصویر غم بادشاہ کے رو برو حاضر
 ہوا تو شوخی تحریر خود منہ سے بول اٹھی، نقش خود فریادی
 بن گیا۔ شاہ جہاں نے آقا رشید کو دربار میں داخل کیا،
 داراشکوہ کی اتالیقی بخشی اور پندرہ سو روپے ماہوار مشاہرہ
 مقرر کیا۔ بعد میں خدمت بیوتات سپرد ہوئی۔ گردش ردو
 ہوئی، امیرانہ شان و شوکت کے ساتھ رہنے لگے۔ آگرے میں
 کئی شاندار عمارتیں اور مسافر خانے تعمیر کرائے، آخر دم
 تک شغل کتابت جاری رہا، شاگردوں کی تعداد میں براہر
 اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ہند و پاکستان کے چاروں
 دارالسلطنتوں، لاہور، آگرہ، دہلی، اور لکھنؤ، میں اس
 فن لطیف کے جار مدرسے قائم ہوئے، ان کی وصلیاں جواہر
 کے سول فروخت ہوتی تھیں۔ ۱۰۸۱ھ میں بمقام آگرہ بعہد
 اورنگ زیب وفات پائی۔

سلطان، عمر شیخ سلطان، میران شاہ گورگانی اور مرزا شاہ رخ — شاعر ہونے کے علاوہ بہترین خطاط تھے۔ یہ جوہر انکی اولاد در اولاد برابر منتقل ہوتا رہا۔ چنانچہ شہزادہ بایسنقر بن شاہ رخ مرزا، شمش قلم ہوئے۔ ان کے کتب خانہ میں جعفر تبریزی تلمیذ میر علی تبریزی کے ماتحت چالیس خطاط کلام مجید اور قلمی کتب لکھنے پر مامور تھے۔ سکندر مرزا ابن عمر شیخ کے دربار میں مولانا معروف بغدادی مشہور خطاط تھے۔ ان کے قلم کی روانی کا یہ عالم تھا کہ جب موج میں آئے اور قلم اٹھاتے تو صبح سے شام تک کی چند ساعتوں میں ڈیڑھ ہزار بیت لکھ ڈالتے۔

بابر : (۹۳۷ - ۹۴۷ھ) کے عہد میں ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کی کیا حالت تھی اس کی تمام کیفیت تزک بابر میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے بابر عہد میں شاہی دفاتر کی جو تنظیم ہوئی وہ بابر ہی کا کرشمہ کار تھا۔ خود بابر خط بابر کا سوجد تھا۔ اس خط کے مشہور استاد میر عبدالحئی مشہدی اکبر آبادی بعہد ہمایوں تھے بابر کا سلسلہ تلمذ میر علی تبریزی سے ملتا ہے۔

ہمایوں : (۹۶۳ - ۹۷۷ھ) بابر نے اپنے عہد میں فن خطاطی کی جو داغ بیل ڈالی تھی ہمایوں نے اسکی معقول نشو و نما کی لیکن عمر اور زمانے نے اسکا ساتھ نہ دیا۔ عبدالحئی کے علاوہ عہد ہمایوں کے مشہور خطاط خواجہ سلطان علی تھے جنکو اکبر نے اپنے زمانے میں افضل خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔ خواجہ عبدالصمد بھی عہد ہمایوں کے خطاط تھے

لیکن یہ دور اکبری میں چمکے۔ بزم خطاطان میں اب تک صرف بادشاہوں اور شہزادوں نے شہرت اور مرتبہ پایا تھا لیکن مخدرات تیموریہ نے جو علم و ادب کا بلند ذوق رکھتی تھیں ابھی تک اس فن لطیف میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا، یہ بھی عہد ہمایونی کی برکت تھی کہ ملکہ گلبدن نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'ہمایوں نامہ' کے ساتھ ساتھ خطاطی کی طرف بھی توجہ دی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ گلبدن کی تقلید میں نور جہاں، جہاں آرا اور زیب النساء مخفی نے بھی اپنے تخیلات سے ادب کو، اور خطاطی سے علم خط کو زینت اور فروغ بخشا۔

اکبر : (۱۰۰۴ - ۱۵۶۳ء) اکبر کا عہد حکومت بلحاظ سلطنت اور باعتبار علوم و فنون ایک زرین عہد متصور ہوتا ہے۔ ابوالفضل کی پیش بہا تصانیف بالخصوص آئین اکبری میں اس عہد کی تمام ترقیات کی تفصیل نہایت شرح و بست کے ساتھ موجود ہے۔

خواجہ عبدالصمد شرین قلم : خواجہ نظام، وزیر شاہ شجاع شیرازی کے فرزند تھے۔ خطاط ہونے کے علاوہ مصور اور شاعر بھی تھے۔ اول ہمایوں کے درباری ہوئے۔ اکبری عہد میں منصب چہار صدی پایا۔ اور فتح پور سیکری کی ڈکسال کے ناظم مقرر ہوئے۔ خشخاش کے ایک دانے پر سورہ اخلاص لکھ کر اکبر کو پیش کی۔

محمد حسین کشمیری زرین رقم : کامل نستعلیق تھے۔ اکبر کی فرمائش پر آئین اکبری کا پورا نسخہ تحریر کیا

تصاویر دوسرے مصوروں نے بنائیں۔

راجہ ٹوڈر مل کھتری : اکبر کے مشہور رٹن اور دیوان اعلیٰ، نہایت ہی زود نگار اور خوش نویس تھے میر فتح اللہ کے مشورہ سے قانون بندوبست اراضی مرتب کیا جو آج بھی کم و بیش ہند و پاک میں رائج ہے۔ اس نسخہ پر صرف شاہی سے تین لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ یہ نسخہ پہلے آجین میں تھا، اب لندن میں ہے ۱۰۲۰ھ میں وفات پائی۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں : بیرم خان کے فرزند رشید تھے۔ ہندی کے مشہور و معروف شاعر، نستعلیق اور ہندی خوشخطی میں کمال حاصل تھا، ان کے ہندی دوہے بہت مشہور ہیں۔

مرزا ایرج اور مرزا داراب : دونوں خان خاناں کے فرزند تھے۔ مرزا ایرج نسخ اور تعلیق اور مرزا داراب محض نستعلیق نگار تھے۔ دونوں بھائیوں کا مشترکہ نمونہ قلم ہفت بند کاشی ہے۔

مرزا عزیز کوکاتاش : جلال الدین اکبر کے رضاعی بھائی، کامل خوش نویس اور با کمال مصور تھے۔

ملا عبدالقادر اخوند : فن خطاطی میں ان کو اکبر بادشاہ کی استادی کا فخر حاصل تھا اور مختلف خطوط کے ماہر تھے۔

عبدالرحیم، عنبریں رقم : ہرات سے ہندوستان آکر خان خاناں کے منظور نظر ہوئے کتب خانہ خان خاناں میں

کتب نویسی پر مامور ہوئے۔ اکبر کو خمسہ نظامی لکھ کر پیش کیا، جو اس وقت لندن میں ہے۔ بادشاہ سے عنبریں رقم کا خطاب پایا ہے۔

میر معصوم قندھاری: والد کا نام سید صفائی تھا۔ آبائی وصف صفائی ان کے ان کتببات سے ظاہر ہوتا ہے جو قلعہ آگرہ اور فتح پور سیکری کی اکثر عمارات پر کندہ ہیں۔

حسین بن احمد چشتی: بلند دروازہ فتح پور سیکری کے پیش طاق کا عربی کتبہ انہی کے کمال کی یادگار ہے۔

پنڈت جگن ناتھ: اکبری عہد کے پہلے کاتب ہیں جنہوں نے ہندی قلموں کو شان اور عروج بخشا۔

ملا علی احمد مہر کن: خط کی جملہ اقسام بالخصوص تعلیق اور نستعلیق کے بہترین خطاط اور حکاک تھے۔ فولاد پر مہریں کندہ کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔

مذکورہ بالا خطاطوں کے علاوہ محمد اصغر عرف اشرف خاں، ہفت قلم، علامہ میر فتح اللہ شیرازی، مظفر علی، خنجر بیگ چغتائی، رائے منوہر، محمد یوسف کابلی اور خواجہ ابراہیم حسین وغیرہ خطاط بھی دربار اکبری سے منسلک تھے۔

جہانگیر: (۱۰۳۶-۱۰۱۴ھ) جہانگیر شعر و شراب اور نغمہ و رباب کا دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ مصوری اور خطاطی سے بھی عشق رکھتا تھا۔ اس کے دربار میں بھی متعدد دربار خطاط موجود تھے۔

مرزا محمد حسین ابن مرزا شکر اللہ : 'ثالث تعلیق اور
نستعلیق کے استاد اور خط شکستہ کے موجد تھے۔ عہد ہمایوں
میں آئے ۱۰۲۸ھ میں وفات پائی۔

شہزادہ خسرو اور شہزادہ سلطان پرویز : دونوں جہانگیر
کے چشم و چراغ تھے۔ اول الذکر خطاط ہونے کے علاوہ
فن انشاء کے بھی ماہر تھے۔ شہزادہ پرویز آخر عمر تک
کلام اللہ لکھتے رہے۔

محمود بن اسحاق سہائق الہروی : نستعلیق کے استاد
تھے۔ دیوان کاسران لکھا جو پٹنہ (بھارت) کی لائبریری میں
موجود ہے۔ اس دیوان پر جہانگیر اور شاہجہاں کے دستخط
ثبت ہیں۔

احمد علی ارشد : عہد جہانگیری کے مشہور طغرا نویس
تھے، بلند دروازہ فتح پور سیکری کے ایک طغرے میں
پنج تن پاک اور خلفائے راشدین رض کے اسماء گرامی کندہ ہیں۔

خواجہ محمد شریف ابن خواجہ عبدالصمد شیریں قلم :
عربی فارسی کے جید عالم اور نستعلیق کے کامل استاد تھے۔
دربار اکبری سے رخصت ہو کر شہزادہ جہانگیر کی خدمت
میں آئے اور امیرالاسراء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ان کے
علاوہ اور بھی کئی خطاطوں نے اس عہد کو زینت بخشی۔

شاہ جہاں : (۱۰۷۶ - ۱۰۳۶ھ) یہ نامور بادشاہ جو
سلاطین مغلیہ میں علوم و فنون کا سب سے زیادہ قدردان اور

سرپرست تھا، بزم خطاطان میں خود بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا خط نستعلیق کا ماہر تھا، خط شکستہ بھی عہد شاہ جہانی کی یادگار ہے جسکی توسیع اور اشاعت کا سہرا شاہ جہاں کے لائق وزیر سعد اللہ خان کے سر ہے۔ شہزادہ دارا شکوہ بھی نہایت خوش رقم خطاط تھا۔ دارا شکوہ کی ایک قلمی وصلی لال قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں موجود ہے جس پر یہ اشعار درج ہیں :-

اے فراق تو یار دیرینہ - غم تو غمگسار دیرینہ
درد تو سہمان ہر روز - داغ تو یادگار دیرینہ

عبدالحق عرف امانت خاں شیرازی : علامی افضل خاں، وزیر شاہ جہاں کے بھائی تھے۔ روضہ تاج محل کے تمام طغریے اور دیگر کتبات بھی اسی ماہر فن کے کمالات کا نمونہ ہیں۔ بالخصوص شاہ جہاں اور مینار محل کے مزارات کے طغریے اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی پاکمال خوش نویسوں نے تاج کے کتبات لکھنے میں حصہ لیا۔ مثلاً - ستار خاں روسی - محمد خان بغدادی - وہاب خان ایرانی - روشن خان شامی - قادر زماں کابلی اور عبدالغفار خاں ملتانوی۔

عبدالباقی حداد : عبداللہ کے نام سے مشہور تھے۔ شاہ جہاں نے ان کو عالمگیر کا استاد مقرر کیا تھا۔ نسخ کے ماہر تھے۔ اس ماہر فن نے دو قرآن مجید لکھے ایک تیس ورقی اور دوسرا چوب قلم۔ دونوں شاہ جہاں کی نذر کئے اور یاقوت رقم (اول) کا خطاب پایا۔ اس فاضل روزگار کے چند اوراق قرآن مجید راقم الحروف کے پاس ہیں ان میں سے ایک ورق



وصفی : داراشکوه



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالْعَاقِبَةُ
لِلْمُتَّقِينَ وَالصَّلَاةُ عَلَى رَسُولِهِ
مُحَمَّدٍ وَآلِهِ أَجْمَعِينَ هَذِهِ مِنْبَهَاتٌ
عَلَى الْأَسْتَعْدَادِ لِيَوْمِ الْمُبِيعَادِ وَ
صَنْفَهَا صَفِي مَعْتَقِدٍ لِلنَّصْرِ وَالْوِدَادِ
إِمَّا بَعْدَ فَا ر مِنْهَا مَا يَكُونُ مِنْ
وَمِنْهَا مَا يَكُونُ ثَلَاثًا إِلَى تَمَامِ الْعَشْرِ

خطاط: احمد بن محمد الحجی (قیاساً ۷۱۱۰ء)
اس تحریر کے دنیا میں صرف تین نسخے موجود ہیں

کا عکس ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ اس نامور خطاط نے ہندوستان میں اپنے کئی شاگرد چھوڑے جو یاقوت رقمی اور یاقوت خانی کے خطابات سے ممتاز ہوئے، ان میں سے دو بہت مشہور ہوئے :-

محمد عارف یاقوت رقم خان : شاگرد رشید حداد، نسخ و ثلث کے استاد، ان کے ایک قلمی قرآن مجید کا عکس بھوپال سے شائع ہو چکا ہے۔ محمد معظم شاہ کے عہد میں وفات پائی ان کے بھانجے نے بھی یاقوت رقم کا خطاب پایا۔ دونوں حداد کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ میر محمد کاظم۔ مولانا حشمت اللہ۔ محمد افضل۔ محمد عسکری۔ ملا باقر کشمیری۔ مقصود علی، میر محمد کاشی وغیرہ استاد شاہجانی دربار سے منسلک تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر : (۱۱۱۸-۱۰۶۹ھ) عالمگیر بھی ماہر فن خطاط تھے۔ حداد کے بعد سید علی خاں حسینی بن آقا مقیم تبریزی کے شاگرد ہوئے۔ خط نسخ اور تعلیق میں متعدد کلام مجید لکھے جو انکی یادگار ہیں۔ مرحوم خواجہ حسن نظامی دہلوی نے بھی ان کا ایک عکسی قرآن مجید شائع کیا تھا جو شائد اب بھی ملتا ہے۔ ماہ نو کراچی کی وساطت سے ہمیں عالمگیر کے نوشتہ قرآن مجید کے ایک ورق کا عکس حاصل ہوا جو زینت مقالہ ہے۔

سید علی خاں حسینی جواہر رقم : میر عماد اور آقارشد ویلمی کے ندیم خاص اور مقلد تھے۔ ہمہ اوقات عالمگیر کی

خدمت میں حاضر رہتے - قیام دہلی کے زمانہ میں شاہی کتب خانہ میں کام کیا - ۱۰۹۴ھ میں وفات پائی - شمس الدین علیخان بھی جواہر رقم ہوئے -

سید محمد باقر : بادشاہ کو ان کا خط بہت پسند تھا - خطوط عالمگیری میں ان کے خط کی جابجا تعریف موجود ہے ، بعض شاہزادے بھی ان کے شاگرد ہوئے -

مرزا جعفر : خط شکستہ کے استاد تھے - عالم گیر نے کفایت خان کا خطاب عنایت کیا تھا ان کے علاوہ اور بھی ہندو اور مسلمان ناسور خطاط تھے جنہوں نے اس فن کو اوج کمال تک پہنچایا - مثلاً کشمیری پنڈتوں اور کائستوں میں پنڈت لچھمی رام ، لالہ سکھ رام ، منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ وغیرہ ، دلی ، لکھنؤ اور آگرے میں رہتے تھے -

محمد فرخ سیر : (۱۱۳۱ - ۱۱۲۴ھ) اس عہد میں عہد عالمگیری کے خطاطوں کے علاوہ حاجی ناہدارخان (استاد شہزادگان) آقا رشید ویلمی کے مقلد اور استاد مرزا حاتم بیگ معظم شاہ میر منشی تھے - مرزا صاحب نے فن انشاء پر بھی ایک کتاب لکھی ہے -

ناصر الدین محمد شاہ : (۱۱۶۱ - ۱۱۳۱ھ) کے پر آشوب زمانے میں یہ مشہور خطاط ہوئے -

۱ - محمد افضل لاہوری ، قادری ، کامل فن ہونیکے باعث عبدالرشید ویلمی ثانی مشہور تھے -

۲ - مولوی حیات علی شاگرد رائے پریم ناتھ ، استاد خط شکستہ ، آثار الصنادید میں ان کا ذکر موجود ہے -

۳ - نواب مظہر خان المخاطب بہ ظفر خان ، نواب روشن الدولہ کے صاحبزادے خط شکستہ کے استاد تھے ۔

۴ - میر محمد موسیٰ سرہندی ملازم دربار شاہی ، میر عماد کے پیرو تھے ۔

شاہ عالم : (۱۰۲۱ - ۱۱۷۳ھ) کے عہد میں مشہور ماہر نسخ قاضی عصمت اللہ خاں ہوئے جن کے متعدد شاگرد تھے ۔ ان میں میر محمدی زیادہ مشہور ہوئے ۔ محمد میر جو میر سوز کے نام سے مشہور ہوئے شاعری کے علاوہ خط سفیعہ اور نستعلیق کے استاد تھے ، درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ بلا کر اپنا استاد بنا لیا ۔

محمد اکبر شاہ ثانی : (۱۲۵۲ - ۱۲۲۱ھ) سولانا غلام محمد راقم دہلوی ۔ ہفت قلم ، حکیم قدرت اللہ خاں کے شاگرد ، نسخ ، نستعلیق ، تعلیق ، ثلث ، شکستہ ، سفیعہ اور ریحان کے ماہر تھے ۔ فارسی میں برصغیر ہند و پاک کے مشہور خطاطان کا ایک قابل قدر تذکرہ لکھا ہے جسے سر ولیم جونس اور مولوی ہدایت حسین نے ایشیاٹک سوسائٹی کالکتہ سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا تھا ۔ ان کے علاوہ سولائی ، حافظ بقا اللہ معلم قلعہ معلیٰ ، میر ابوالحسن خوش نویس درباری وغیرہ اس عہد کے مشہور خطاط گزرے ہیں ۔

عالمگیر ثانی : (۱۱۶۷ھ) اس عہد کے مشہور و معروف خطاط عماد الملک غازی الدین خاں فیروز جنگ تھے ، ہفت زبان شاعر اور ہفت قلم خطاط تھے ۔ نستعلیق مرزا محمد علی

کی طرز پر اور نسخہ یاقوت رقم کے انداز پر لکھتے تھے عام مراسلت شفیعہ میں کرتے تھے - ۱۲۰۰ھ میں بمقام کالپی وفات پائی - دوسرے خوش نویس مرزا ارجمند تھے، شفیعہ مختلف انداز میں لکھتے تھے، مصور بھی تھے، غازی الدین خان کے ملازم تھے -

ابوظفر بہادر شاہ : (۱۲۷۳-۱۲۵۳ھ) سلاطین مغلیہ کے آخری تاجدار تھے، گو اپنے اسلاف کے ایک قابل فرزند اور لائق جانشین تھے لیکن گردش فلک اور انقلاب دوراں کے ہاتھوں شاہ شطرنج ہو کر رہ گئے تھے، شاہ عالم کے عہد میں شاہ عالم کی حکومت از دہلی تا پالم رہ گئی تھی وہ اب گھٹتے گھٹتے اور سمٹتے سمٹتے بہادر شاہ کے حق میں صرف لال قلعہ کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی - بخت کی نارسائی اور حالات کی ناسازگاری نے بادشاہ کو جس منزل پر پہنچایا، اس کا اور اسکی اولاد کا جو حشر ہوا وہ ایک ایسا واقعہ دلدوز اور سانحہ روح فرسا ہے جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا - ایسے ناگفتہ بہ حالات اور کوائف میں علوم و فنون کی کیا ترقی ہوتی - اس لحاظ سے یہ صرف بہادر شاہ ہی کا اعجاز شاہانہ، اسکی علم دوستی اور ادب پروری ہی تھی کہ اس کے جیتے جی علوم و فنون پامال اور برباد نہیں ہوئے، ان کی وہ درگت نہ ہوئی جو ایسے ماحول میں متوقع تھی - بہادر شاہ کی حیثیت ایک پنشن خوار شخصیت سے زیادہ نہ تھی لیکن اس بے زری اور کوتاہ دستی کے باوجود اس نے بے جگری اور دریا دلی سے کام لیا - اپنے ہی قلیل صرف خاص سے اہل فن

گی حتی المقدور سر پرستی اور قدردانی گی ، کسی کو بھوگا اور فاقہ کش نہ ہونے دیا ۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اسی چار دیواری کے اندر کبھی دیوان عام میں جلوہ عام اور کبھی دیوان خاص میں بجرائے خاص ہوتا تھا ۔ دربار میں علماء فضلاء ادباء ، شعراء ، اہل فن اور اہل ہنر باریاب اور عطیات خسروانہ سے فیض یاب ہوتے ۔ مذہبی مجالس ، ادبی محافل اور جلسہ ہائے موسیقی سے غذائے روحانی پاتے ۔ عید ، بقرعید اور عام دنوں میں جمعہ کے جمعہ جب جامع مسجد کے فلک بوس میناروں سے کعبہ کی دلربا اذان بلند ہوتی تو لال حویلی سے یہی شہر یار آجڑے دیار کی شاہجہانی مسجد کا رخ کرتا ۔ کڑکتیوں کی کڑکتی ہوئی صداؤں۔۔۔ با ادب با ملاحظہ ! ہشیار نگاہ رو برو ! بادشاہ سلامت جہاں پناہ !!۔۔۔ کے درمیان سواری بادبہاری زر و جواہر بکھپرتی مسجد کی سیڑھیوں تک پہنچتی ، یہ سیڑھیاں بھی جو بادشاہ کے دم قدم سے ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی تھیں شاہ کے قدم پا کر اور گرم ہو جاتی ۔ مسجد کے گرد و نواح کا بازار گل گلزار اور چوک سراپا بہار بن جاتا کبھی سر شام زینت محل جاتے تو چاندنی چوک میں چاند نکلنے سے پہلے چاندنی کھل جاتی ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر قربان ہونے لگتے ۔ جمنا شاہ کو جھروکوں میں دیکھ کر روزانہ صبح شام درشن کیا کرتی تھی ، اس چوپڑ والی نہر کے نصیب جاگتے ۔ کیسی شب بدر اور کہاں کا چاند ، رخ شاہی کا عکس پاتے ہی نہر میں مد و جذر آجاتا ۔ بیقرار لہریں فلک کو آئینہ دکھانے لگتیں ۔

عرس، تیج، تمہوار، میلوں ٹھیلوں اور سیر گل فروشان
 گی نوبتوں پر نواح شہر میں بستی حضرت نظام الدین محبوب الہی
 اور حضور خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کا موضع مہرولی
 چند دنوں کے لئے دوسرا شاہ جہاں آباد بن جاتا۔ کیا کیا
 سناؤں اور کہاں تک روؤں اس گئے گذرے وقت میں بھی کیا
 کچھ نہ تھا۔ کون تھا؟ جس نے اس بزم آخر کا تماشا نہیں
 دیکھا۔ دیکھنے والی آنکھوں نے وہ بھی دیکھا اور یہ بھی
 دیکھا کہ جب وقت پڑا اور بادشاہ بے بس اور لاچار ہو گیا
 تو رو پڑا، ساری رعایا رو پڑی 'شاہ و ملکہ دونوں روتے
 ہوئے' سب کو روتا چھوڑ کر 'مغلستان' دلی کے زمین و
 زمان اور سکین و مکاں سے منہ موڑ کر رنگون رخصت ہوئے۔
 سچ سچ ہم سے زیادہ رنگون خوش قسمت ہے کہ ہمارا یہ
 آخری متاع دل و جاں، نشان عزت و اماں اسکو نصیب ہوا۔
 آہ! جملہ معترضہ کے طور پر یہ ایک آہ تھی جو بیساختہ دل
 سے نکل گئی۔

گلزار خطوط میں بہادر شاہ نے جو قلمیں لگائیں اور ان
 سے جو گل و بوٹے کھلے ان میں سے بہت سے باد سموم کے
 جھونکوں سے مرجھا گئے جو باقی ہیں وہ اسکی زندہ بہار اور
 ابدی یادگار ہیں۔

بہادر شاہ خود ایک ماہر خطاط، استاد نسخ و نستعلیق
 تھے۔ دلی میں ان کا شاہی زینت محل 'حکیم احسن اللہ خان
 طبیب شاہی کی حویلی اور درگاہ حضرت صابر چشتی کے کتبات
 ان کی خطاطی کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔ شہزادوں کو خود
 اصلاح دیا کرتے تھے۔ ان کے عہد کے مشہور خطاط یہ تھے:

بدر الدین علی خان مرصع رقم : یہ بدر کامل اور
 شہر یار قلم اپنے نانا شیخ محمد یار کا شاگرد، آقا عبدالرشید
 ویلمی کا مقلد، نسخ، نستعلیق، ہندی اور انگریزی خطوط
 کا ماہر، اپنے وقت کا سب سے بڑا حکاک تھا۔ شاہی سواہیر
 کے علاوہ تمام وزراء امراء اپنی مہرین اسی سے تیار کراتے
 تھے۔ مرزا غالب کی تاریخی مہرین بھی اسی یگانہ روزگار
 کی یادگار ہیں۔ مرحوم نے اپنی وصلیوں اور تمام مہروں کا
 ایک البم مرتب کیا تھا لیکن انکی اولاد ان کی اس یادگار کو محفوظ
 نہ رکھ سکی۔ ہمارے پاس ہمارے دادا سید محمد شاہی امام
 مرحوم جامع مسجد دہلی کی ایک انگوٹھی ہے۔ اس کے عقیق
 پر بدر الدین نے ان کا نام اور سن کندہ کیا تھا۔ ان کے
 علاوہ سید سنور علی شاگرد میر پنچہ کش، استاد نسخ و نستعلیق
 اور دوسرے سید حسین علی مشہور خوش نویس اور حکاک
 گزرے ہیں۔

سید محمد امیر رضوی : (پنچہ کش) : میر صاحب
 پنچہ کشی، بانک، خطاطی، مصوری، نقاشی، جدول نگاری،
 صحافی، علاقہ بندی، سنگ تراشی، کون سا فن تھا جس کے
 وہ ماہر نہ تھے۔ مولانا غلام محمد دہلوی اپنے تذکرہ
 خطاطان میں لکھتے ہیں کہ میں نے ان کے یہ جرہر دیکھ کر
 ان کو آغا رشید ویلمی کی چند وصلیاں دیں اور کہا کہ وہ
 اس خط کی مشق کریں۔ میر صاحب نے اس مشق کو ایسے
 کمال پر پہنچایا کہ آقائے ثانی بن گئے۔ سید اور آقا کی وصلیوں
 میں شناخت ناممکن ہو گئی۔ ماہ محرم میں میر صاحب

آقا رشید کا عرس کرتے تھے، فاتحہ خوانی کے بعد علم الخط کی اصلاح اور ترقی کیلئے اساتذہ فن کے درمیان باہم تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ راجہ الور کی فرمائش پر سترہ سال کی مدت میں گلستان سعدی کا نسخہ مکمل کیا۔ یہ آج تک الور میں موجود ہے، اس وقت اسکی قیمت ایک لاکھ سے بھی زائد ہے۔ اُن کا مکان محلہ پہاڑی اصلی پر تھا۔ چھت کی کڑیوں پر میر صاحب نے ”یا فتاح اور بسم اللہ شریف“، لکھی تھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی میں گولی کھا کر شہید ہوئے۔ میر صاحب کے تین شاگرد بہت مشہور ہوئے :

آغا مرزا، دہلوی : میر صاحب کے شاگرد رشید، ماهر نستعلیق، انہوں نے بھی گلستان لکھی اور اسے مصور کیا۔ میر صاحب کے ہم پلہ اور اپنے وقت کے استاد ہوئے اپنے بعد رحیم اللہ اور میر مدد علی الوری کو اپنا شاگرد اور جانشین چھوڑا۔

مرزا عباد اللہ بیگ ابن مرزا عبداللہ بیگ : بچپن ہی سے میر صاحب کے سامنے زانوئے ادب طے کیا اس لئے آغا مرزا پر سبقت لے گئے۔ زمرد رقم کا خطاب پایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پٹیالہ میں مامور ہو گئے، انکی اولاد میں مرزا محمود نے خوش نویسی میں مہارت حاصل کی اور اس فن پر ایک کتاب لکھی۔

حافظ سید امیر الدین : میر صاحب کے شاگرد سوم ہیں، اُن کو بھی نسخ اور نستعلیق میں کمال حاصل تھا۔ ہم نے انکی دو وصلیاں پاکستان کے عجائب خانہ میں داخل کی ہیں۔

سید حامد ابن سید محمد امام جامع مسجد دہلی :
 راقم الحروف کے والد ماجد ، سید امیرالدین کے شاگرد خط نسخ
 کے ماہر تھے ، ان کی خطاطی کا نمونہ قرآن مجید کا ایک
 ورق زینت کتاب ہے ۔

منشی ممتاز علی : حضرت بہادر شاہ کے تلمیذ یافتہ ،
 دور جدید میں موٹی مٹی کی نشانی ، اردو بازار دہلی کے مایہ
 ناز استاد نسخ و نستعلیق تھے ۔ ہم نے بھی اپنے لڑکپن میں
 انہیں دیکھا تھا ۔ جب آپ حجاز گئے تو خانہ کعبہ کے
 پردے پر آپکو خطاطی کی دعوت دی گئی قرآن مجید ، دیگر
 کتبات اور طغرے آج بھی آپکی یاد گار ہیں ۔ متعدد شاگرد
 چھوڑے ان کے صاحبزادگان منشی مشتاق علی اور منشی
 عبدالعنی ان کے جانشین ہوئے ۔

محمد جان فرزند میاں محمد عاشوری : میر کان کے
 شاگرد تھے ۔ بزمانہ ولیعہدی ابو ظفر کی سرکار میں ملازم تھے ۔
 میر جلال الدین ابن امام علی : اپنے والد کے شاگرد
 تھے ، باپ اور بیٹے دونوں ابو ظفر کی سرکار میں زمرہ
 خطاطان میں تھے ۔

شنکر ناتھ کشمیری : خط شکستہ کے استاد ، بہادر شاہ
 کے میر منشی تھے ۔ ۱۲۶۱ھ میں انتقال ہوا ۔

سید محمد ناصر وزیر : حضرت خواجہ میر درد کے نواسے
 تھے نسخ اور نستعلیق میں کمال حاصل تھا ۔

سید حیدر حسین خان : سید حیدر علی کے فرزند ، عربی فارسی کے عالم ، نسخ اور خط گزار کے ماہر تھے ریاست بیکانیر میں سہتم بندوبست تھے ۔ عہد شاہی میں ان کے باپ داروغہ توپ خانہ تھے ۔

میر امام علی : امام الدین کے لڑکے تھے ، ان کا شغل لطیف طبابت تھا اور نسخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے ۔ ان کے علاوہ مسلمانوں میں مرزا احمد یار بیگ استاد نسخ ، مرزا عبدالرزاق ماہر نستعلیق اور سید رحمت علی خط نسخ اور نستعلیق میں مشہور ہوئے ۔ اہل ہنود میں راجہ امید سنگھ اور راجہ شیر سنگھ ، راجہ ناگرمیل کے خاندان سے تھے رائے پریم ناتھ کے شاگرد ہوئے ، کافی نام پایا ۔ منشی لچھمن سنگھ ، پنڈت لچھی رام (شاگرد محمد حفیظ خان) کنور پریم کنور ۔ راجہ نند رام ، منشی خوش وقت رائے وانگی ، لالہ درگا پرشاد اور شنکر نوساری بھی مشہور خطاط ہوئے لیکن افسوس ان کے حالات کا ہمیں کوئی علم نہیں ۔

گزشتہ لکھنؤ : جب خاندان تیموریہ کی یادگار سلطنت بہادر شاہ کا ٹمٹماقا ہوا چراغ گل ہو گیا ، اسلامی سلطنت ختم ہو گئی ۔ دہلی مٹ گئی ۔ ہزاروں دہلی والے خاک میں جا سوئے اور پس ماندگان سوگوار اور اشکبار ہو کر رہ گئے تو بچے کھچے ان لوگوں نے جو دہلی کے روح رواں اور اور اہل کمال تھے اپنی تباہی اور بربادی کے بعد اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ دہلی چھوڑ کر فیض آباد اور لکھنؤ وغیرہ میں جا بسیں ۔

يُرَاهُ لِنَسَانٍ أَنَا خَلَقْتَهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ

سُبْحَانَ مَا يَدَّبُّ عَلَيْهِ

مَبِينٌ وَضَنٌّ لَنَا مِثْلَهُ وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ مِثْلِي

أَيُّ سَبِيلٍ مِثْلِي

الْعِظَامُ وَهُوَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا

سَلَّمَ اللَّهُ تَعَالَى

أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّن

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا انْتَمَرْتُم مِّنْهُ تُوقَدُونَ

سُبْحَانَ عِزِّي

أُولَئِكَ الَّذِينَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلَى

قُدْرَتِي صَلَّى اللَّهُ

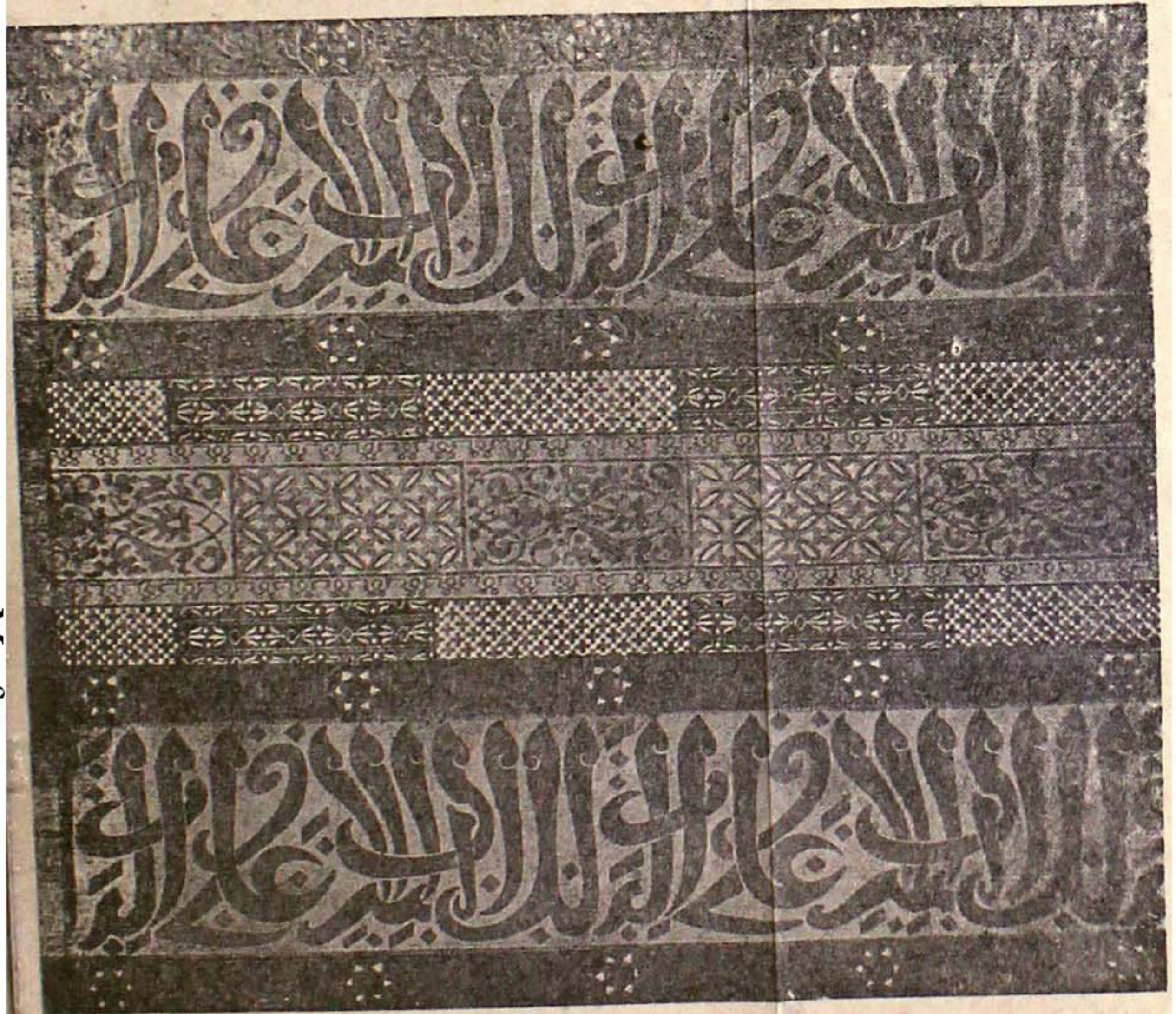
أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَدَلًا وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ إِنَّمَا أَمْرُهُ

وَاصْحَابِي وَآزْوَاجِي

إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

سَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا

Marfat.com



ریشمی بافت میں خطاطی کا کمال

صوبہ اودھ ان کی دلداری اور دل نوازی کا طلبگار اور
 متمنی تھا۔ اس لئے کہ دولت مغلیہ کی وزارت کا شرف بہت
 پہلے سے ناظران یا صوبہ داران اودھ کو حاصل ہو چکا تھا۔
 پہلے وزرائے اودھ کہلائے، بعد ازاں انگریزوں کی خوشامد کی بدولت
 نواب غازی الدین حیدر خان کے عہد میں ۱۲۲۹ھ سے شاہان اودھ
 ہو گئے۔ شاہ کہلانے کے بعد وقار شاہی کا تقاضا تھا کہ
 دربار لکھنؤ میں بھی وہی آن بان اور شان ہو جو شاہان مغلیہ
 کے درباروں سے مختص تھی۔ ویسے بھی دہلی کی تہذیب
 و تمدن کا نقشہ آن کے روئیں روئیں میں بسا ہوا تھا۔ یہی
 وجہ تھی کہ وہ لکھنؤ کو لکھنؤ یا دوسری دلی بنانا چاہتے
 تھے۔ چنانچہ جب دہلی کے باکمال بلائے اور بن بلائے
 لکھنؤ پہنچے اور شاہان اودھ نے انکی شاہانہ انداز پر قدردانی
 اور سرپرستی کی تو لکھنؤ اپنے معراج کمال پر پہنچ گیا،
 بلکہ فنون لطیفہ کے بعض شعبوں میں تو دہلی سے بھی بازی
 لے گیا۔ یہ تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ اور آخری جھلک
 تھی، جہاں تک لکھنؤ کے علوم و فنون کے ارتقا اور ترقی کا
 تعلق ہے تاریخ شاہد ہے کہ اسکا آغاز نواب شجاع الدولہ کے
 عہد ۱۷۷۲ - ۱۷۵۲ء سے ہوا۔ اس وقت لکھنؤ میں آغا
 عبدالرشید ویلمی کے دو شاگرد، مہر نستعلیق اور شکستہ
 استاد وقت تھے۔

منشی چندربھان دہلوی اور منشی سیج بھان : اول الذکر

عہد شاہجانی کے مشہور انشاء پرداز اور شاعر تھے، ۱۸۰۳ء
 میں انتقال ہوا۔

میر محمد عطا حسین مرصع رقم: اس دور کے تیسرے استاد تھے۔ محمد باقر ضغرا نویس (عالم گیر کے درباری) کے فرزند تھے، مشہور قصہ چہار درویش جو نواب شجاع الدولہ نے لکھوایا تھا آپ ہی کی تصنیف ہے۔ نسخ، نستعلیق اور شفیعہ میں کمال حاصل تھا۔

شرر لکھنوی مرحوم کی رائے ہے کہ علم خط کی ترقی آصف الدولہ کے عہد کی سرہون منت ہے ان کے عہد ۱۷۷۴ء - ۱۷۹۸ء میں عبدالرشید ویلمی کے دو شاگرد جو لاہوری تھے لکھنؤ میں وارد ہوئے، یعنی -

حافظ نور اللہ اور قاضی نعمت اللہ: آصف الدولہ نے ان دونوں استادوں کو ازراہ قدردانی اپنے دربار میں جگہ دی۔ قاضی نعمت اللہ کو شہزادوں کا اتالیق اور نور اللہ کو دفتر انشاء میں مقرر کیا۔ ان دونوں حضرات کی بدولت لکھنؤ میں فن خطاطی کو بڑا عروج اور فروغ حاصل ہوا۔ حافظ نور اللہ کی مقبولیت اور شہرت کا تو یہ عالم تھا کہ لوگ ان کی وصلیوں کو موتیوں کے عوض خریدتے تھے۔ حافظ صاحب کے نامور شاگردوں میں سے چار بہت مشہور ہوئے۔

حافظ محمد ابراہیم ابن حافظ نور اللہ: انہوں نے اپنے خط میں ایک مجتہدانہ شان پیدا کی باقی تین شاگرد منشی سرب سنگھ دیوانہ، میاں وجہہ اللہ اور محمد عباس تھے۔

حافظ محمد ابراہیم کے بھی کئی شاگرد ہوئے، ان کے فرزند حافظ سعید الدین، منشی عبدالحمید (خریطہ نگار) منشی

ہادی علی اور پنڈت منسا رام جو نستعلیق اور نسخ کے علاوہ
 طغرا نگاری میں بھی ماہر تھے ، منشی ہادی علی کے شاگرد
 رشید منشی شمس الدین اعجاز رقم ہوئے ۔ انہوں نے خطاطی
 پر کئی رسالے لکھے ۔ آخری دور لکھنؤ میں اکثر خطاط اعجاز
 رقم ہی کے تلمیذ یافتہ تھے ۔ اسی طرح قاضی نعمت اللہ کے
 صاحبزادے مولوی محمد اشرف اور مولوی قل احمد ہوئے ان
 شاگردوں کے بھی متعدد شاگرد ہوئے ۔

آغا عبدالرشید ویلمی کے مقلدین میں مرزا محمد علی بن
 مرزا خیر اللہ فرماں نویس اور ان کے شاگردوں میں خلیفہ
 بخش اللہ اور میر نثار علی مشہور ہیں ۔ خط شکستہ میں مرزا
 احمد طباطبائی استاد ہوئے ۔ ان کے علاوہ کتابت خاں ، میر
 سید علی خاں ، حاجی قاسم ، حافظ محمد خورشید ، محمد
 نصیر الدین اور محمد بہاء اللہ نے شہرت اور ناموری پائی ۔
 طبقہ علماء میں سے علامہ تفضل حسین خاں (عہد
 اصناف الدولہ) نستعلیق اور شکستہ کے استاد تھے ۔ انشا اللہ خان
 انشا سے ان کے گہرے مراسم دوستانہ تھے ۔

دور حاضر : کے شہرہ آفاق خطاط منشی محمد یوسف خلف
 منشی محمد دین مرحوم ہیں ۔ یوسف کے حسن قلم کے نقوش
 سے پارلیمنٹ اور سیکریٹریٹ نئی دہلی کے در و دیوار آراستہ
 ہیں اور اب مملکت پاکستان ان کی پر کاری سے فیض یاب
 ہو رہی ہے ۔ موجودہ پاکستانی نوٹوں میں یوسف ہی کا
 حسن خط جلوہ گر ہے ۔ کسی کو رقابت کا بھی یارا نہیں ۔
 کون اپنی انگلیاں کٹوائے ۔ یوں ان کا فیض عام جاری ہے ۔

اُن کے نامور شاگرد عبدالمجید دہلوی خلف غلام محمد مرحوم مشہور خطاط ہیں، جو یوسف کے غمزہ و ناز نہیں اٹھا سکتے انہیں مسجد کی عشوہ گری اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

مجید ابھی نوجوان ہیں، چالیس کی عمر میں یہ عالم ہے کہ تقریباً تمام خطوط میں اُن کا قلم پرکاریاں دکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے آرٹ سے نئے نئے ڈیزائن پیدا کر کے حسن کی بھی تخلیق کرتے ہیں۔ مزار قائد اعظم کا کتبہ انہی کا لکھا ہوا ہے۔ شاہ فاروق اور شاہ ظاہر شاہ جب پاکستان آئے تو انہوں نے دونوں کر ایک ایک رباعی لکھ کر پیش کی۔ مسجد کے شاگرد رشید امتیاز علی دہلوی عرف پیر جی ہیں، انہوں نے بھی نسخ اور نستعلیق میں کمال حاصل کیا ہے۔

سوجود دور ترقی میں ہماری خواتین بھی مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں بالخصوص شعر و ادب میں لیکن فن خطاطی میں سخدرات تیموریہ کے سوا آپ نے اب تک کسی خاتون کا نام نہ سنا ہوگا۔ اس فن لطیف میں بھی ہمارے پاکستان میں دو با کمال خوش نویسہ موجود ہیں۔ اول یوسف صاحب کی حقیقی بہن فاطمہ الکبریٰ دہلوی ہیں جو خط نسخ میں قرآن مجید لکھتی ہیں۔ دوسری خاتون انوری صاحبہ دہلوی، مولوی عبدالحمید مدیر رسالہ مولوی، دہلی کی خالہ زاد بہن ہیں، امتیاز علی کی شاگرد ہیں اور اردو نستعلیق لکھتی ہیں۔

اسی طرح لاہور میں تاج الدین زرین رقم مرحوم نہایت مشہور و معروف خطاط تھے۔ الماس لاہوری حیات ہیں جو اپنے الماسی خط سے خط میں چمک دمک پیدا کر رہے ہیں۔ بنگال، سرحد اور سندھ میں بھی نامی گرامی خطاط موجود ہیں۔ افسوس! ہم ان ماہران فن کے نام نامی سے واقف نہیں۔ یقین کیجئے کہ اس میں ہماری کوتاہی کو مطلق دخل نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار اول تو خود وہ خطاط ہیں جو جواہر رقم کرتے ہیں لیکن اپنا نام نہیں لکھتے۔ پھر ان ناشرین کی ستم ظریفی ہے کہ مصنف، مؤلف مترجم اور مطبع کا نام تو قانون کے ماتحت درج کرتے ہیں اور اس خوش رقم کو قطعاً فراموش کر دیتے ہیں جو اپنے حسن کتابت سے کتاب کو زینت بخشتا ہے اور چار چاند لگانا ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر اخبار رسالے اور کتاب میں کاتب یا حرف پرداز (کمپوزیٹر) کا نام اور شہریت لازمی طور پر درج کی جائے۔ اگر یہ تجویز عمل میں آگئی تو یقین کیجئے کہ یہ ایسی حکمت اور خدمت ہوگی کہ ہر عہد اور ہر دور کا تذکرہ خطاطان بغیر کسی کاوش و سعی کے خود بخود مرتب ہوتا رہے گا۔ بہر حال اس عذر و معافی کے ساتھ ہم بشرط زندگی، فرصت اور معلومات آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کی ضرورت تلافی کریں گے۔

دیگر ممالک میں رسم الخط : ہمارے موضوع اور سلسلہ خطوط کا تقاضا یہ تھا کہ مصر، عرب اور عجم کے بعد ان ممالک اور اقوام کا ذکر کرتے جہاں عربی و فارسی خطوط نے ماضی بعید یا قریب میں رواج پایا اور آج بھی وہاں مستعمل

ہیں اس کے بعد برصغیر ہند و پاک کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ یہ تقدیم اور تاخیر مصلحتاً اس لئے عمل میں آئی کہ ابھی ہمیں اپنے ملک پاکستان کے مسئلہ رسم الخط کو بھی زیر بحث لانا اور اس پر اظہار خیال کرنا ہے۔ اس ضمن میں یقیناً دوسرے ممالک کے خطوط کا حوالہ دینا پڑتا اور حوالہ اسی وقت دیا جاسکتا ہے کہ اسکی نظیر پہلے سے موجود ہو، موجودہ مقام ہی اس کا صحیح مقام ہے لہذا اپنے ملکی مسئلہ رسم الخط کو چھیڑنے سے قبل ہم دیگر ممالک کے رسوم الخط کی کیفیت بیان کرتے ہیں:

تاریخ کی روشنی میں کم از کم اب تک یہ تو ثابت ہوچکا ہے کہ دنیائے اسلام کا صدیوں کا مشترکہ مقدس خط عربی ہے اور اس کا نام نسخ ہے، اس کے بعد نستعلیق کا مقام ہے۔

ترکی : خلافت بغداد اور دولت مغلیہ کے زوال کے بعد ایشیا اور یورپ میں اسلام کی علمبرداری سلاطین عثمانیہ کو مقدر ہوئی، چنانچہ موجودہ دور جمہوریت سے قبل تمام سلاطین عثمانیہ کا لقب امیر المومنین تھا۔ اس وقت بغداد، اصفہان، شیراز اور دلی مرحوم کی طرح قسطنطنیہ بھی علم و ادب کا گہوارہ اور مرکز تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترکی کے اس دور سلوکیت میں لسانیات اور علم خط نے بڑا عروج پایا۔ چنانچہ تحقیقات ماہر میں کتاب انتشار الخط العربی کے حوالہ سے ہمیں ایک مشہور و معروف خطاط مولانا ضیاء الحق حسام الدین چلبی مرید خاص حضرت مولانا روم متوفی (۶۸۳ھ) کا ذکر ملتا

ہے۔ یہ نستعلیق کے استاد تھے۔ مشنوی شریف کا ایک بڑا حصہ انہی کا نقل کردہ ہے۔

باب عالی میں ترکی خطوط—دشتی اور دیوانی— کے ساتھ ساتھ نسخ، محقق، ریحان، ثلث، توقیع اور رقاع جاری تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا مرحوم کے دور سیادت میں مغربیت کے زیر اثر اب عام مراسلت لاطینی رسم الخط میں ہوتی ہے غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جغرافیائی اعتبار سے یورپ سے بہت قریب ہے۔

مصر : دنیا میں جس قدر نمونے خطوط کے موجود ہیں ان کی تاریخ مصر سے شروع ہوتی ہے اور مصری ہی اس کے موجد ہیں۔ عرب کے دیگر علوم و فنون کا منبع اور سرچشمہ بھی مصر ہی ہے۔ بالخصوص عہد فاروقی رض سے اب تک اسلامی حکومت قائم ہے اور اس کا ایک سرچشمہ اب بھی ”جامع ازہر“، اسلامی یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے جس سے تشنگان علوم سیراب ہو رہے ہیں۔

مصر کی سرکاری زبان عربی اور رسم الخط نسخ ہے اور اس نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ آج اس کا اپنا ٹائپ اور ٹیلی پرنٹر تک موجود ہے جس کے ذریعہ اسلامی ثقافت اور صحافت زندہ اور مستحکم ہے۔ علماء مصر کی مختلف علوم و فنون پر مشتمل پیش بہا تصانیف آئے دن مصر سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔

عراق، حجاز، نجد، یمن، شام، جسطرح پنج تن پاک کے نام ہمارے ورد زبان ہیں اسی طرح ان مقامات سے اسلام کی قدیم تہذیب اور تاریخ وابستہ ہے اور یہ وابستگی اور

رشتہء اخوت ایسا ہے جو ابد تک نہیں ٹوٹ سکتا۔ آغاز اسلام سے دور حاضر تک اسلامی حکومت چلی آتی ہے۔ ماضی بعید میں یہ ممالک خط کوفی کے مرکز تھے لیکن فی زمانہ یہاں بھی عربی زبان اور خط نسخ جاری ہے۔

الجزیرہ، مراکش، قیرواں، ٹونس، طرابلس؛ یہ بلاد مغربیہ کہلاتے ہیں۔ ان کی زبان اور رسم الخط بنیادی طور پر عربی ہے لیکن موجودہ خطوط مغربیہ—خط الفاسی، خط ٹونسی اور خط الجزیرہ—جو خط کوفی سے ماخوذ ہیں، کی طرز کتابت پیچیدہ اور نسخ کے حسن سے نسبتاً محروم ہے چونکہ یہ ممالک فرانس کی سیادت اور قیادت میں ہیں اس لئے فرانسیسی خط بھی جاری ہے۔

سوڈان، زنجبار، حبش، حوسیہ، مدگاسکر، ہلجاشیہ؛ ان ممالک میں بھی عہد اسلام سے عربی خط رائج ہے، اصحہ نجاشی والئی حبش رسول اکرم ص کا وہ رفیق صادق تھا جس کے نام حضور کا سب سے پہلا فرمان رسالت جاری ہوا۔ حبش کا موجودہ خط، مذکورہ بالا مغربی خطوط سے ماخوذ ہے مگر بھدا اور ثقیل ہے۔ حوسیہ، مدگاسکر اور ہلجاشیہ کا عام اور مراسلتی خط نسخ ہے۔

اندلس؛ جب قیرواں سے ممالک مغربی کا دارالخلافت اندلس میں منتقل ہوا تو یہاں ایک نیا خط، خط اندلسی یا قرطبی جاری ہوا جو شمالی امریکہ میں پھیلا اور قدیم رسم الخط فنا ہو گیا۔ اندلس کی قدیم عمارات کے کتبات قدیم خط کوفی میں ہیں۔

روس : اس کے ماتحت قازن، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دیگر ان صوبوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں زبان عربی اور رسم الخط نسخ ہے۔ تمام دنیا میں اشتراکیت کی نشر و اشاعت کے لئے روس درجہ اول کی تمام زبانوں اور رسوم خط میں اپنا پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ اسی لئے اس نے پاکستان کی سب سے زیادہ مقبول زبان اور رسم الخط اردو یا نسخ ٹائپ میں اپنا روسی لٹریچر شائع کیا ہے۔ چنانچہ کتاب حوالہ ”یو، ایس، ایس، آر“ کی ایک ضخیم جلد میں اسکا دستور اور تمام ملکی ترقیات کی مفصل کیفیت مذکور ہے۔

چین : چینی زبان اور رسم الخط دونوں نہایت مشکل ہیں۔ ان کو سیکھنے کے لئے کم از کم چار ہزار الفاظ یاد کرنیکی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس زبان میں ایک لفظ کا تلفظ تقریباً دس یا اس سے بھی کچھ زائد معانی کا حامل ہے۔ قدیم خط مصور تھا۔ پرانے کتببات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۸۲۷ ق م سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک رائج رہا۔ اس کے بعد حرفی دور آیا۔ گارساں دتاسی اپنے مقالہ ۱۸۷۲ء میں لکھتا ہے :

”چینی مسلمانوں کے زیر اہتمام مطابع جاری ہیں جہاں سے عربی کتابیں شائع ہوتی ہیں جن میں متن کے ساتھ ساتھ چینی ترجمہ بھی درج ہوتا ہے“

دور حاضر میں بھی جن مقامات پر مسلمانوں کی اکثریت ہے عربی زبان اور خط نسخ رائج ہے۔ مختلف شہروں میں جا بجا عربی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چین نے بھی اپنے ملک کے دستور اور ترقیاتی کارناموں کو ایک نہایت ہی خوبصورت

جلد میں مصور شائع کیا ہے جس میں چینی، نسخ اور روسن ٹائپ میں تمام کیفیت درج ہے۔

ایران : جدید ایران مختلف علوم و فنون کا مرکز ہے۔ حکومت اور عوام کی زبان فارسی اور رسم الخط نسخ اور نستعلیق ہے۔ متعدد رسائل و اخبارات کے علاوہ آٹھ دن نہایت بیش قیمت اور مفید کتب شائع ہوتی ہیں۔

فرانس : مولانا شبلی مرحوم کے بقول :

وہ نیزہ خونفشاں جو چل کر ٹھیرا تھا فرانس کے جگر پر ابتدائی اور درمیانی فتوحات اور عربی تمدن کے زیر اثر فرانس میں عربی زبان اور عربی خط رائج ہو گیا تھا ورنہ اس سے قبل لاطینی حروف ابجد جاری تھے۔ عربی خط ۱۰۹۱ء تک جنوبی اطالیہ اور سسلی میں جاری رہا جسکا ثبوت فریڈرک ثانی کی قبر واقع روم (سسلی) کے آس کتبے سے ملتا ہے جو عربی میں ہے۔ آج بھی پیرس میں عربی کی نایاب کتابوں کے علاوہ اخبار اور رسائل جاری ہیں۔ اردو کی صداقت اور مقبولیت کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گارساں دتاسی مشہور فرانسیسی مستشرق ہندوستان سے نہ صرف عربی فارسی بلکہ ہندی اور اردو کا تمام لٹریچر فرانس منگا کر اپنی علمی پیاس بجھاتا تھا اور اس سے دوسروں کو بھی سیراب کرتا تھا اس بھی خواہ اردو کے خطبات عالیہ سر راس مسعود مرحوم کی عنایت اور انجمن ترقی اردو کی توجہ سے ہمارے اردو ادب میں داخل ہو چکے ہیں۔

لندن : کمبرج اور آکسفورڈ دونوں جامعات میں عربی تو بہت پہلے سے داخل تھی نیز عربی کتابت پر مستشرقین کو جو عبور پہلے حاصل تھا اب اس میں بھی کچھ ترقی ہو گئی ہے۔ جہاں تک اردو اور خط نستعلیق کا تعلق ہے ہندوستان میں عہد برطانیہ کے آغاز ہی سے سلطنت کا کاروبار چلانے کیلئے لندن کی دونوں جامعات میں شامل ہو گئے تھے اور آج تک شامل ہیں۔ اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگریزوں نے اپنی زبان انگریزی اور لاطینی یا روسن رسم الخط کو اپنا ذریعہ بنایا، ہنوز یہی وسیلہ جاری ہے۔ انگلستان کے بعض مطابع کتب عربی بھی شائع کرتے ہیں لیکن فرانس اور جرمنی سے کم۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں السنہ شرقیہ کے قدیم و جدید ادب اور آرٹ کی ایک بڑی دولت محفوظ ہے، حضرت اقبال مرحوم کے بقول :

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
کہ دیکھو انکو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارہ
پاکستان میں بھی برطانوی محکمہ اطلاعات کی جانب سے
مختلف قسم کا لٹریچر اردو زبان اور رسم الخط میں نہایت
اعلیٰ پیمانے پر شائع ہو رہا ہے۔

جرمنی : یہاں عربی زبان کی تعلیم کا رواج اور معیار بلند ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ عربی کی تعلیم کے لئے ہم جرمن پروفیسروں کو اپنے ملک میں بلاتے ہیں۔ ہمارا اردو نستعلیق ٹائپ سب سے پہلے جرمن ہی میں ایجاد ہوا تھا۔ اسکا

خوبصورت نمونہ جیبی سائز کا دیوان غالب اردو اور مسیح الملک حکیم اجمل خان شیدا دہلوی کا دیوان ہے۔ اپزگ (جرمنی) سے عربی کی اکثر نادر و نایاب کتب شائع ہوتی ہیں۔ جرمنی میں اردو ٹائپ روز بروز فروغ پا رہا ہے جسکا ثبوت ادارہ اطلاعات جرمنی کا وہ لٹریچر ہے جسکی اشاعت پاکستان میں ہو رہی ہے۔

ہالینڈ : السنہ شرقیہ (عربی، فارسی، چینی) کا مرکز ہے۔ لیڈن کا نامور مطبع برل عربی کی اکثر قدیم و نایاب تاریخی کتب شائع کرتا ہے۔ یہاں خط نسخ کے خطاط بھی موجود ہیں۔

امریکہ : روس اور برطانیہ کی طرح امریکہ سے بھی عربی اخبارات، رسائل اور کتب شائع ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے وہاں عربی کتابت بھی جاری ہے۔ آج امریکن سیاح اور علم دوست امریکی ہمارے عربی۔ فارسی اور اردو تبرکات قدیم کے ہم سے زیادہ محافظ قدردان اور خریدار ہیں۔ روس کی طرح امریکہ کے شعبہ اطلاعات نے بھی اپنے دستور اور ملکی ترقیات سے پاکستان کے عوام کو مطلع کرنے کیلئے اردو زبان اور نسخ ٹائپ میں نہایت شاندار مصور مجلدات شائع کئے ہیں۔

انڈونیشیا : ماضی قریب میں ہمارے ساتھ ساتھ آزاد ہوا ہے، وہاں مسلمانوں کی تعداد ۶ کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ اردو بولنے اور لکھنے والے یہاں بھی موجود ہیں۔ عربی زبان اور خط نسخ کا بھی رواج ہے، انڈونیشیا کے محکمہ اطلاعات نے

بھی اپنے ملک کی ترقیات اور ترقیاتی منصوبوں کو نسخہ ٹائپ میں شائع کر کے پاکستانی عوام سے اپنا رشتہء محبت و اخوت زندہ اور تازہ کیا ہے۔ سرکاری زبان ملائی ہے اسکا خط نسخہ ہے۔ جاوا اور ملایا: ان دونوں جزیروں کے باشندوں نے رسم الخط کی تعلیم عربوں سے حاصل کی لیکن بعد میں اپنے رسم الخط میں چند نقاط اور چند کششوں کے ذریعہ ایزاد اور ترمیم کر لی ہے۔ لیکن مراسلت عربی رسم الخط میں کرتے ہیں۔

کردستان: گو زبان بالکل جدا ہے لیکن خط زمانہء دراز سے عربی ہے جس میں حسب ضرورت انہوں نے ذاتی تصرفات سے کام لیا ہے۔

افغانستان: یہ بھی ہمارا قدیم گہوارہء اسلام ہے اور ایک مدت دراز کے بعد ہوشیار اور راہ ترقی پر گامزن ہوا ہے۔ دفاتر کی زبان فارسی اور بولی پشتو ہے۔ افغانی ابجد میں (۴۰) حرف ہیں جو نسخی کہلاتے ہیں۔ سلاطین غوریہ میں ملک معز الدین محمد بن سام نہایت زود نویس اور خوش رقم تھے۔ سلطان محمد خندان، سلطان علی مشہدی کے شاگرد اور ماہر نستعلیق تھے۔ میر عبدالرحمن ہروی استاد نستعلیق کا شمار آقا عبدالرشید ویلمی کے شاگردان میں ہوتا ہے۔ سید محمد داؤد الحسنی ماضی قریب میں نامور خطاط گذرے ہیں، اس با کمال خوش نویس نے گلستان سعدی کا دیباچہ جو (۵۵۵) کلمات یا (۲۲۷۰) حروف پر مشتمل ہے صرف ایک مربع انچ پرزہ کاغذ پر تحریر کیا تھا۔

پامیر : قبل اسلام پامیریوں کا قومی خط پہلوی تھا اب بھی
افغانی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھتے ہیں ۔

بلوچستان ، مکران : بلوچی ابجد عربی ہے ، لیکن اس
میں چار حروف (پ ، چ ، ژ ، گ) اور تین حروف ہندی (ٹ ،
ڈ ، ژ) اپنے ہاں شامل کر لئے ہیں ۔

بھارت : دور حاضر میں عربی زبان اور رسم الخط نسخ اپنی
مذہبی حیثیت میں صرف مسلمانوں کیلئے باقی رہ گیا ہے ۔
فارسی زبان صرف اہل ذوق کا سرمایہ نشاط ہے ۔ اردو زبان
اور خط نستعلیق جو قیام پاکستان سے قبل سنسکرت ، ہندی ،
پنجابی ، بنگالی ، گجراتی ، مرہٹی ، کشمیری ، گورمکھی ، تامل
اور ملایالم وغیرہ تمام ہندوستانی زبانوں اور رسوم خط پر
چھایا ہوا تھا اب اسے ہر جگہ ہر طرح سے ختم کیا جا رہا
ہے ، ختم ہوگا یا نہیں ، لیکن صورت حال یہ ہے کہ سیاسی
تقاضوں کے پیش نظر دیگر صوبہ جاتی زبانوں اور رسوم خط سے تو
چشم پوشی برتی جا رہی ہے اور ہندی بھاشا اور دیوناگری
رسم الخط کے روپ میں صدہا برس کی قدیم اور نیم مردہ ،
دیوتاؤں کی زبان سنسکرت میں از سر نو روح پھونکی جا رہی
ہے ۔ قیام پاکستان سے قبل ریاست حیدر آباد دکن نے اردو
نستعلیق اور نسخ عربی میں نہایت کامیاب ٹائپ ایجاد کیا تھا ۔

ھمارا رسم الخط

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

(اقبال)

رسم الخط

تاریخ کی روشنی میں اقوام عالم کے قدیم و جدید رسوم الخط کا یہ سرسری سا جائزہ ثابت کرتا ہے کہ تاریخ ایجاد خط سے عہد حاضر تک جس طرح سینکڑوں زبانوں نے جنم لیا اسی طرح رسم الخط نے بھی ہزاروں روپ بدلے، نئی نئی صورتوں میں ابھرا اور بے شمار شکلوں میں ہمارے سامنے آیا۔ ہزاروں برس کی اس مسلسل تبدیلی کو دیکھ کر با آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ دنیا اپنی ارتقائی رفتار میں زمانہ قدیم کی بہ نسبت ترقی کرتے کرتے بہت آگے نکل آئی ہے لیکن با این ہمہ اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ کمالات انسانی کی معراج اور منتہا کس مقام پر ہوگی، نظر بر این یہی صورت زبان اور رسم الخط کی ہے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ جو اس وقت پاکستان میں زیر غور اور بحث ہے تاریخ و تہذیب کا کوئی نیا واقعہ یا حادثہ نہیں، اس سے پہلے بھی برصغیر ہند و پاک میں رسم الخط کی تاریخ اس نوع کے متعدد تغیرات اور تجربات سے گزر چکی ہے۔ حرف راقم میں ہم اس حقیقت کا اظہار کرچکے ہیں کہ پہلے یہ مقالہ محض تاریخ خطاطی اور مختصر تذکرہ خطاطان پر

مشمول تھا۔ اُس وقت ہمیں رسم الخط کی تبدیلی کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اسی لئے ہم سنسکرت اور ہندی نژاد زبانوں کی تاریخ اور رسوم خط کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر گئے تھے، اب چونکہ یہ مسئلہ درپیش ہے لہذا لازم ہے کہ اس پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

ابتدا میں آپ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ طوفان نوح کے بعد جب سام بن نوح کی اولاد دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی اور بابل میں مہذب حکومتوں کا قیام ہوا تو متعدد زبانیں (السنہ سامیہ) وجود میں آئیں جن کی مختلف شاخوں نے متمدن دنیا میں رواج پایا۔ ان زبانوں میں تاریخ السنہ کی رو سے آریں، سامی اور منگولین (مغائی) ام الاسنہ کہلاتی ہیں۔ اقوام عالم میں آریں کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ جب یہ قوم مشرق سے مغرب (یورپ اور ایشیا) میں داخل ہوئی تو ان کی زبان نے متعدد زبانوں کو جنم دیا۔ ایشیا میں سنسکرت اور فارسی نے شہرت پائی اور یورپ میں یونانی اور لاطینی مقبول ہوئیں اسی طرح جب تبت اور خط سے مغلوں نے نقل و حرکت کی تو چینی، سیامی اور برمی زبانیں پیدا ہوئیں جن کی ایک مشہور شاخ ترکی ہے، گویا اصل ماخذ سامی کی شمالی شاخ سے آراسی اور عربی زبانیں نکلیں۔ اس عربی سے خط کوفی نکلا جس کا ترقی یافتہ خط عربی نسخ اور اردو نستعلیق ہے۔ دوسری جانب سامی الاصل کی جنوبی شاخ سے سبائی اور سبائی سے ہندوستانی زبانیں وجود میں آئیں۔ آخر الذکر ہندوستانی زبانوں کی شاخیں، پالی، دیوناگری اور ڈریوڈین کہلائیں۔

پالی سے برمی، سیامی، جاوائی اور سنگالی،
دیوناگری سے کورین، کشمیری، گجراتی، مرہٹی اور بنگالی،
اور ڈریوڈین سے سلائی، تامل، تلنگو اور کناری زبانیں نکلیں۔
اس جائزہ سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ
موجودہ ایشیائی اور یورپی تمام رسوم الخط سامی الاصل رسم الخط
سے ماخوذ ہیں۔ تمام دنیا کے رسوم الخط (بجز چینی رسم الخط
کے کہ وہ اوپر سے نیچے کی طرف لکھا جاتا ہے) دو صورتوں
میں منقسم ہیں، ایک صورت دائیں سے بائیں اور دوسری بائیں
سے دائیں طرف تحریر کرنیکی ہے۔ لیکن سامی الاصل رسم الخط
کی اساس پر یہ کہنا غلطی نہ ہوگا کہ عہد حاضر کی یورپی،
دیوناگری، اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی تحریریں بھی
ابتدا میں دائیں سے بائیں سمت ہی لکھی جاتی تھیں مگر
مرور ایام اور حالات کے تقاضوں نے ان کے قدیم رخ کو
تبدیل کر دیا۔

لاطینی رسم الخط جو اس وقت رومن رسم الخط کے نام
سے مشہور ہے کوئی تین ہزار سال پرانا ہے اور بلاشبہ اس
نے اس طویل مدت میں اپنے ارتقائی اور تدریجی منازل سے
گزر کر اپنے آپ کو اس قدر مہذب اور مقبول بنا لیا ہے کہ
آج اسکا اپنا ٹائپ اور ٹیلی پرنٹر دونوں موجود ہیں۔

عربی رسم الخط (نسخ) جو سامی رسم الخط سے ماخوذ
ہے، اسکی عمر کم و بیش چھ ہزار سال ہے یہ بھی ازمنہ
قدیم سے نشو و نما اور ترقی پاتے پاتے اب اس درجہ مرصع
اور مکلف ہو چکا ہے کہ آج جا بجا صفحہ روزگار پر اس کے
ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر کے نقوش مرتسم ہیں۔

عربی کے بعد سنسکرت کا مقام ہے، جس طرح عربی اپنی وسعت، فصاحت و بلاغت اور صرف و نحو کے اعتبار سے ایک جامع اور بسیط السنہ ہے، اسی طرح سنسکرت بھی اپنی جگہ ایک مکمل اور فصیح و بلیغ زبان ہے اور کسی دوسری زبان کی محتاج نہیں بلکہ بعض مادوں اور اشتقاق کی بناء پر قدیم فارسی بھی دراصل سنسکرت ہی کی ایک شاخ ہے۔ اسی لئے آریا قوم اپنی زبان پر فخر کرتی ہے اور یقیناً اُس کا یہ فخر اُسکو زیب دیتا ہے۔

جب آریا قوم ہندوستان میں داخل اور حکمران ہوئی تو اُس وقت یہاں کے لوگ مختلف ہندی زبانیں (عوام کی بولیاں) جو ”پراکرت“ کہلاتی تھیں، بولتے تھے۔ اُنکی یہ بولیاں آریا قوم کے غلبہ اور اقتدار کے باوجود اس حد تک سنسکرت پر اثر انداز ہوئیں کہ ایک مدت دراز تک سنسکرت کے دوش بدوش بولی جاتی رہیں، بالآخر اُن کو سنسکرت کے سامنے بالکل اسی طرح مغلوب ہونا پڑا جس طرح عہد حاضر میں یورپ کی زبانیں لاطینی کے زیر اثر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندی جو اپنے اوصاف دلربائی اور دل نشینی کے علاوہ اپنی قدامت اور اہمیت کی وجہ سے سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے سنسکرت کے نام سے کبھی موسوم نہیں ہوئی ہمیشہ اپنے ہی نام سے باجتی اور گونجتی رہی۔ ”ہندوستانی“ کا جدید نام اہل یورپ کا ساختہ اور پرداختہ ہے۔

اب اردو کو لیجئے۔ یہ دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اور اُس زمانہ کی یادگار ہے جب سرزمین ہندوستان نے مسلمان فاتحین کے قدم چومے۔ (۶۹۹۸ء) اور (۶۱۰۳۲ء) کے

درمیان سلطان محمود کے عہد میں اس کی ایک ہلکی سی داغ بیل پڑی۔ چونکہ یہ زبان لشکر شاہی میں بولی گئی اور ”لشکر“ کو ترکی زبان میں ”آردو“ کہتے ہیں اس لئے اردو کہلائی۔ محمود کے بعد غوری، خلجی، تغلق، لودھی اور آخر میں مغل سلاطین آئے جو (۱۸۵۷ء) تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔ اس طویل قیام کے باعث ملکی باشندوں سے میل جول اور ربط و ضبط میں ترقی ہوئی۔ سیاسی اور تجارتی امور کے تقاضوں سے شاہ و رعایا ایک دوسرے کی زبان سمجھنے اور سیکھنے پر مجبور ہوئے، اس طرح ملک کی زبان میں ایک نا معلوم سا تغیر پیدا ہونے لگا۔

ان فاتحین کی زبان ترکی اور فارسی تھی، فارسی کے علاوہ وہ عربی سے بھی روحانی شغف رکھتے تھے کیونکہ یہ انکی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ ان کے قدیم علوم و فنون کا بیشتر سرمایہ بھی اسی زبان میں تھا۔ ابتدا میں اس تبدیلی کی یہ کیفیت رہی کہ محلات اور دفاتر شاہی میں تو فارسی کا اوڑھنا اور بچھونا رہا لیکن ہندوستانی عوام نہایت آزادی کے ساتھ قدیم ہندی پراکرت بولتے رہے سنسکرت قریب قریب مردہ ہو گئی۔ بعد ازاں ہندی آہستہ آہستہ فارسی اور عربی سے مخلوط ہونے لگی پھر وہ زمانہ آیا کہ ہندو، فارسی اور مسلمان، ہندی شوق کے ساتھ سیکھنے لگے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عربی، فارسی اور بھاشا میں بڑے پیمانے پر لین دین ہونے لگا۔ عربی نے اردو کو فصاحت و بلاغت بخشی۔ فارسی نے لطافت و شیرینی عطا کی، ہندی نے رس اور لوچ پیدا

کیا، سنسکرت اور ترکی کا بھی اس میں رنگ آیا اور یوں یہ انگھڑ بولی اس طرح بنی اور سنوری کہ اس کا رنگ، روپ اور جو بن نکھر آیا۔ قدیم بھاشا حسرت و یاس کے عالم میں اردو کی طرف ڈکر ڈکر دیکھنے لگی۔ بالآخر اس کو اپنا رہن بسیرا برج کی گلیوں میں کرنا پڑا۔ برج کی جو گن بنکر برج بھاشا کہلانے لگی۔ یہ کہنا کہ مغل اردو کے باغباں تھے بڑی حد تک غلط ہے۔

حق یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ اصول جہاں داری اور جہاں بانی سے واقف تھے اور رعایا کے دلوں پر حکومت کرنا جانتے تھے، علم و فن کے جوہا اور قدر دان تھے، انہوں نے ہمیشہ جغرافیائی حد بندیوں اور ذاتی رجحانات اور جذبات سے بلند تر ہو کر اپنے علوم و فنون دوسروں کو بخشے اور ان کے سرمایہ کو اپنا ورثہ سمجھا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اردو خود بخود برصغیر ہند و پاک کی راشٹر بھاشا، قومی زبان، بنتی جا رہی ہے انہوں نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ یہ اردو کی خود اپنی ہمہ گیر صلاحیت تھی کہ اس نے عربی، فارسی، ترکی اور متعدد دوسری زبانوں کو اپنے میں جذب کر لیا۔ بلاشبہ اردو، سنسکرت کی طرح نہ تو آریوں کے ساتھ باہر سے آئی اور نہ ترک اور افغان، عربی و ترکی کی طرح اسے اپنے ہمراہ ہندوستان لائے اور نہ انہوں نے اہل ہند پر اسے زبردستی ٹھونسا۔ یہ تو ہندوستان میں از خود پیدا ہوئی اور ملک کی مشترکہ قومی ضروریات نے اسے خود ہی پروان چڑھایا۔

بہر نوع آردو کے حق میں ان مسلمان بادشاہوں کا تو یہ طرز عمل اور روا داری تھی لیکن سلطنت مغلیہ کے آخری ایام حکومت سے اور بالخصوص زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی (انگریزوں) نے عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی کے ساتھ کیا سلوک کیا وہ ایک داستان دل خراش ہے۔ ان سفید فام حاکموں نے انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنے کی مثل کو صادق کر دکھایا۔ عالمگیر انسانیت، خلوص اور روا داری کے نام پر پہلے چرسا بھر زمین مانگی لیکن اپنی عیاری سے پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے آگ لینے آئے تھے لیکن اپنے کرتوتوں سے ہمیشہ ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں آگ لگاتے رہے خود بچے رہے اور جب صحیح سلامت واپس گئے تو اپنی لگائی ہوئی آگ کو بھڑکتا ہوا چھوڑ گئے۔

(۱۷۶۴ء) میں جنگ بکسر کے بعد شاہ عالم نے جو اپنے باپ دادا کی طرح علم نواز اور ادب پرور تھا لارڈ کلائیو سے معاہدہ کرتے وقت عہد نامہ میں یہ شرط رکھی کہ کمپنی ہندوستانی علم و ادب کی حفاظت اور نگہداشت کریگی اور اخراجات شاہی کے لئے ۲۶ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ بھی شاہ کو پیش کرے گی۔ اس معاہدہ کا کس طرح احترام کیا گیا وہ وارن ہسٹنگز کے عمل سے ظاہر ہے۔ ایک ادنیٰ سا بہانہ تراش کر یہ وظیفہ بند کیا گیا۔ اس زخم کا جو سرہم تجویز ہوا وہ بھی سن لیجئے۔ السنہ شرقیہ کی اصلاح اور ترقی کے نام پر ڈاکٹر جان گل گرسٹ نے پہلے ایک سوسائٹی قائم کی، پھر (۱۸۰۰ء) میں لارڈ ہسٹنگز نے

فورٹ ولیم کالج میں ایک کالج قائم کیا جسکی دو شاخیں تھیں، ایک سنسکرت کی ہندوؤں کے لئے اور دوسری عربی و فارسی کی مسلمانوں کیلئے۔ حالانکہ اس سے قبل ہندو، عربی اور فارسی پڑھتے تھے اور مسلمان، سنسکرت اور بھاشا، اور یوں دو بھائیوں کی طرح آپس میں شیر و شکر رکھتے تھے۔ اب جو دو مدرسے، دو استاد، دو زبانیں اور دو خیالات ہوئے تو دونوں کا حال و قال بدل گیا۔ ایک دوسرے کے درمیان بغیریت اور مخالفت پیدا ہونے لگی، یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن کر الگ الگ ہو گئے دراصل ہندی اور اردو کے درمیان خلیج اور ہندوستان کے بٹوارے کی بنیاد بھی یہیں سے قائم ہوئی ہندوستانی ذہنیت تبدیل کرنے اور نفاق پھیلانے کی یہ بڑی باریک اور گہری سیاسی چال تھی۔

انگریزوں نے اپنے دفاتر سے سنسکرت اور فارسی کو یکدم اور یک قلم دیس نکالا نہیں دیا اگر وہ ایسا کرتے تو بڑی فاش غلطی ہوتی۔ اسی لئے ان دانایان فرنگ نے پہلے اردو کا بازار گرم کیا، اسے بنگال سے پنجاب تک پہنچایا۔ مسٹر ام کریو کے بقول اس وقت اردو کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس طرح فرانسیسی زبان تمام یورپ میں بولی جاتی ہے، اسی طرح اردو، ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک عوام کی زبانوں پر کھیل رہی تھی لیکن اندر ہی اندر فارسی کی جڑیں کھوکھلی ہو کر رہی تھیں یہاں تک کہ (۱۸۳۳ء) میں فارسی خارج ہوئی اور اردو کے تقارے پر کمپنی کا ڈنکا بجنے لگا۔ یہ تھا وہ خارجی

ماحول جس میں اردو ادب نے صحیح معنوں میں پہلی بار
آنکھ کھولی اور پرورش پائی -

مسلمان احسان فراموش اور ناشکر گزار نہیں - ڈاکٹر
گل گرسٹ نے ایک معقول عرصے تک اردو کی خدمت کی
لیکن ڈاکٹر صاحب کا مقصد تنہا یہ نہ تھا - اس خدمت کے
پردے میں دراصل ان کو اپنے ملک و قوم کی خدمت منظور
تھی اور وہ یہ تھی کہ جو انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی میں
ملازم ہو کر ہندوستان آئیں وہ اردو داں بن کر اعلیٰ مناصب
اور معقول مشاہرے حاصل کریں اور اس طرح ہم پر حکومت
کرتے رہیں - یہی نہیں بلکہ تجارت کے ٹھیکہ دار بن کر
ہندوستان کی دولت دھڑی دھڑی کر کے لوٹیں اور لندن
لیجا کر اپنے ولایتی گونوں کو بھریں - الغرض ان سیاسی
اغراض کے ماتحت اردو کی خوب نشو و نما کی گئی لیکن ایسی
نشو و نما کہ ہم اپنی قدیم ایشیائی زبانوں سے محروم ہو کر
”قصہ طوطا مینا“، پڑھنے لگے، ”آرائش محفل“، میں محو
اور ”باغ و بہار“، میں گم ہو گئے - ادب کی افادیت اور
مقصدیت فنا ہو گئی - ”ادب برائے زندگی“، کی بجائے ”ادب
برائے ادب“، ہو کر جمالیات اور رومانوں کی نذر ہو گیا لوگ
حیات مستعار سے بد دل ہو کر ڈوبنے اور مرنے کی راہ دیکھنے
لگے بلکہ بعض تو بہاں تک دل برداشتہ ہوئے کہ فلاح
بعد مرگ سے بھی مایوس ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ :

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہاروں اور ماموں نے علوم و فنون کے جو خزانے دنیا میں

اپنی یاد گار چھوڑے تھے اور جن سے پورا یورپ متمتع ہوا
 تھا وہ ہم سے ہزاروں کوس دور سمندر پار ہی رہے۔ وہ بھی
 تو اردو میں منتقل ہو سکتے تھے اور جو ہوئے وہ اس طرح
 کہ ان کا قالب انگریزی تھا اور لباس رومن۔

غضب خدا کا ہمارا ملک، ہماری زبان اور ہماری
 ہی تحریر اور اس کی صرف و نحو کے موجد اور راقم انگریز۔
 کوئی ان سے پوچھے کہ ہم ہندوستان میں پیدا ہوئے،
 دم پیدائش سے نوبت مرگ تک اپنی آواز اور اپنی زبان میں بولے،
 اسی میں لکھا اور پڑھا اور ہم ہی ان سے صرف و نحو کی تعلیم
 لیں۔ نکتہ چینوں کو ہماری آنکھ کا تنکا تو نظر آیا آنکی آنکھ
 میں جو شہتیر پڑا تھا وہ ان کو نہ سوجھا، شہرہ آفاق شیکسپیئر
 انگلستان کا ٹھیٹ باشندہ، مادری زبان انگریزی، کلام بے مثل
 و لاجواب اور صرف و نحو کی اغلاط سے معمور۔ ایک اور
 لطیفہ ملاحظہ ہو، برنارڈ شاہ کے بعد جب گالروزی کو
 ”نوبل پرائز“ ملا تو لوگوں نے برنارڈ شاہ سے گالروزی کے
 متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا ”یہ بڑی خوشی کی بات ہے،
 وہ بہت ہی اچھا لکھتا ہے مگر اس کا سب سے بڑا عیب یہ
 ہے کہ وہ نہایت صحیح انگریزی لکھتا ہے۔“

انہی ڈاکٹر گل گرسٹ نے انگریزی اردو لغت کی تالیف
 اپنے ذمہ لی لیکن کمپنی چونکہ اردو کی مخالف تھی اس لئے
 وہ بھی ادھوری رہ گئی۔ اس انگریزی سوسائٹی اور ولیم کالج
 سے تو وہ اردو سوسائٹی بسا غنیمت تھی جو (۱۸۴۰ء) میں
 بعہد حضرت بہادر شاہ جرمن ڈاکٹر ’اسپرنگر‘ کی نگرانی میں

قائم ہوئی تھی جس کے کرتا دھرتا منشی کریم الدین پائی پتی،
پنڈت رام کشن، پنڈت اجودھیا پرشاد، ہردیو سنگھ اور لالہ
رامچندر ہوئے۔ ان لوگوں کی بدولت تذکرہ شعرائے عرب، تذکرہ
شعرائے ہند اور نا معلوم کیا کیا کچھ وجود میں آیا۔

قصہ کوتاہ جب فارسی کی رسم فاتحہ ہو گئی تو لارڈ
میکالے نے اردو کا بھی تیجہ کر ڈالا جسکی بابت انہوں نے
انیسویں صدی کے آغاز میں یہ کہا تھا۔

”انگریزی تعلیم دینے سے آہستہ آہستہ

ہندوستانی ایک قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو

رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی

لیکن خیالات، رجحانات، تہذیب اور معاشرت کے

لحاظ سے یکسر مغربی ہوگی“۔ (کمپنی کی حکومت)

۱۸۳۵ء میں فورٹ ولیم کالج کا دروازہ بند کیا گیا

اور آکسفورڈ، لندن کے پیمانے پر کاکتہ یونیورسٹی کا قیام

عمل میں لایا گیا۔ تکمیل شوق کی خاطر یا آنسو پونچھنے

کیلئے السنہ شرقیہ برائے نام داخل نصاب رہیں، اس طرح

بڑے ٹھاٹ کے ساتھ انگریزی کے درس شروع ہو گئے۔

محکوم ہندوستانی الف سے اللہ اور رے سے رام چپنے کی

بجائے، سی اے ٹی، کیٹ، آراے ٹی، ریٹ اور جی او

ڈی، گوڈ، میں گٹ یٹ کرنے لگے۔

انگریزی زبان کی تعلیم کے خلاف ہندوستانی رعایا

ہی نے نہیں، ہنری کارٹر، ونسنٹ اسمتھ اور دیگر انگریز

مدبروں اور پادریوں تک نے آواز بلند کی، انہوں نے بار بار

بتایا کہ محض فوجی قوت کے بل بوتے پر ہندوستانی اقوام پر حکومت کرنا محال ہے جنکی زبان اور رسم و رواج میں اختلاف ہے محکوم قوم کی ہمدردی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب حکومت اپنی رعایا سے براہ راست تعلق پیدا کرے مشہور پادری مستشرق گارساں دتاسی سالہا سال تک تعلیم بذریعہ انگریزی کے خلاف اور اردو زبان اور رسم الخط کی حمایت میں اپنے خطبات میں جہاد کرتا رہا لیکن انگریزوں کے کان پر ایک جوں تک نہ رینگی۔

یہی شکایت اور مطالبہ ہمیں اپنے پاکستان کے سابقہ حاکموں سے رہا اور موجودہ حکومت سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ تمام علوم و فنون کی تعلیم ہمیں اپنی زبان میں دے جو اسکی بجائے طور پر صلاحیت رکھتی ہے سر سید اعظم رح نے صدہا مخالفتوں کے طوفان اور کفر کے فتوؤں کی آندھیوں میں ”سائینٹفک سوسائٹی اور مدرسہ العلوم، علیگرہ“ قائم کیا۔ بہزار حیلہ و خوشامد انگریزی کی تعلیم دی، غیر ملکی علوم و فنون پڑھائے لیکن ذریعہ تعلیم اردو رکھا۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے بھی سر سید اعظم رح ہی کی تقلید کی اور برسوں کی منزلیں مہینوں میں طے کرائیں۔ اردو کا خزانہ علوم و فنون سے معمور کر دیا۔ ہمارا ”اردو کالج، کراچی“، بھی اسی کی یادگار ہے، بابائے اردو اسی سوئی مٹی کے موٹام ہیں۔ ہم انگریزی کے نہ پہلے دشمن تھے اور نہ آج ہیں، کسی زبان کے بھی دشمن نہیں، ہمارا اختلاف تو صرف

ذریعہ تعلیم کا ہے۔ ۱۵۰ طویل برس گذر جانے کے باوجود نہ ہم کو صحیح معنوں میں انگریزی آئی اور نہ علوم و فنون حاصل ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ہم یورپ کے فونوگراف بن گئے، ہمارے دیسی ریکارڈ پر انگریزی نغمہ بجنے لگا۔

دراصل زبان و معاشرت کا اختلاف بہت ہی سخت ہوتا ہے، انگریزوں نے اپنی حکومت کی خاطر ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط سیکھا، جب وہ اس کے ماہر ہو گئے تو ہمیں دھتا بتائی، ہماری بلی ہمیں سے سیاؤں کرنے لگی۔ مذہب کی بنیاد پر ہندی اور اردو کی جو خلیج انہوں نے بنگال میں قائم کی تھی وہ اب پایاب ہو گئی۔ صدیوں کا میل ملاپ اور بھائی چارا ٹوٹ گیا۔ ہندو اپنا مندر اور مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ الگ چننے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ نا اتفاق یہاں تک بڑھی کہ دشمنی بن گئی۔ ہندوؤں نے کہا کہ اردو زبان اور اسکا رسم الخط قرآنی ہے۔ ہم دیوتاؤں کے پجاری ہیں، سنسکرت زبان اور دیوناگری رسم الخط، دیوتاؤں کی زبان اور دیوتاؤں کی تحریر ہے ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اپنی زبان اپنے خط اور اپنے مذہب کو بھرشٹ کریں۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم توحید کے پرستار ہیں، ہمارا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، کتاب ایک ہے اور مذہب، زبان اور تمدن بھی ایک ہے۔ بلاشبہ عربی ہماری مذہبی زبان ہے۔ یہ اردو جس سے اب تمہیں پرخاش ہے، ہماری زبان نہیں، تمہاری ہے،

ہم تو ترکی اور فارسی بولتے آئے تھے، اسے ہم نے یہاں آکر تم سے سیکھا، تمہاری ہی خاطر اسے عزیز کیا، اب اس سے یہ انحراف، سنسکرت سے عقیدت اور عربی سے دشمنی کیوں؟ بقول ڈاکٹر سپرو، اردو اب ایک مشترکہ قوی سرمایہ بن چکی ہے جسکی تقسیم ناممکن ہے۔ اگر تم اسے چھوڑ سکتے ہو تو چھوڑ دو نیم مردہ اور فراموش شدہ سنسکرت کو اختیار کر سکتے ہو تو کرلو لیکن اردو سے کنارہ کش ہونا اب ہمارے لئے محال ہے۔

اس قضیہ نے ایسا طول پکڑا کہ برسوں خون خرابے رہے اور کوئی فیصلہ نہ ہوا، آخر انگریزی سرکار میں دونوں طرف سے آزادی کا مقدمہ پیش ہوا۔ یہ مقدمہ بھی شیطان کی آنت ثابت ہوا۔ ہزاروں متعلقہ اور غیر متعلقہ تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دوران میں بھی ہم برابر لڑتے کھیتے اور سرتے رہے آخر وطن تقسیم ہوا۔ ایک دل تھا اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ دونوں طرف از سر نو انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ ہزاروں عصمتیں برباد ہوئیں، لوگ در بدر ہوئے، تباہی و بربادی آئی اور انگریز ہم پر اور ہماری حالت زار پر ہنستے اور مسکراتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔ اب اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ۔

اب آزاد بھارت کا یہ فیصلہ ہے کہ اردو کو دیوناگری رسم الخط اختیار کر لینا چاہیے اور اپنا پرانا رسم الخط جو عربی سے ماخوذ ہے چھوڑ دینا چاہیے۔ رسم الخط

کی اس تبدیلی کی موافقت اور مخالفت میں اہل ہند کے پاس اپنے حالات اور تقاضوں کے پیش نظر کافی وزنی دلائل اور ثبوت موجود ہیں اور اس کے لئے وہ آپس میں سر بہ گریباں بھی ہیں۔ ہمیں ان کے اس گھریلو اور داخلی مسئلہ سے بظاہر کوئی سروکار نہیں لیکن یہ کیا قیامت ہے؟ کہ جس مذہب زبان اور تہذیب کی خاطر ہم نے فلک شگاف نعرے لگائے، اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور آثار ثقافت کو ٹھیس پہنچائی، بہت کچھ کھو کر یہ محدود اور مختصر سا خطہ پاک قبول کیا۔ کیا یہ اس لئے قبول نہ کیا تھا کہ یہاں ہم آزاد ہوں گے، ہمارا مذہب، ہمارا دستور، ہمارا نظام تعلیم، ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط آزاد ہوگا۔ کسی کو ہماری طرف ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے کی مجال نہ ہوگی۔ اگر مذہب کا تہذیب سے، تہذیب کا ثقافت سے، ثقافت کا زبان سے اور زبان کا رسم الخط سے کوئی رشتہ نہیں تو تقسیم ہندوستان کے جواز میں یہ سوال بار بار اور پے درپے کیوں اٹھایا گیا تھا؟ اگر صرف رسم الخط ہی کی تبدیلی منظور خاطر ہو سکتی تو آج بھارت کی قومی زبان ہندی کے بجائے بڑی حد تک اردو ہی ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ دیوتاؤں کی زبان اور دیوتاؤں کی تحریر تھی تو کیا انگریزی زبان اور لاطینی رسم الخط اسلامی ہے؟ کیا یہ غیر جنس نہیں؟ کیا اسے غیر جنسوں نے محض اپنی خاطر ایجاد نہیں کیا تھا۔ رومن رسم الخط کی تجویز ہی اس وقت پیش کی گئی تھی جب اردو ٹائپ کا کوئی وجود نہ تھا۔ اردو ٹائپ کی ایجاد اور پریس کا انعقاد بھی

اسی ضرورت کے ماتحت (۱۸۴۰ء) کے لگ بھگ ڈاکٹر گل گرسٹ کی کوششوں سے پہلی بار کلکتہ میں وجود میں آیا تھا۔ پھر سنگی مطبوعات قائم ہوئے، مصوری کی جگہ فوٹو گرافی نے لے لی، اس طرح فنون لطیفہ میں سے خطاطی اور مصوری رو بہ زوال ہو کر محض تکملہ شوق کی حد تک باقی رہ گئی۔ پہلے ہمارے علوم و فنون کے شاہ پارے تمام تر قلمی ہوتے تھے، دیوان خانوں کی آرائش و زیبائش قلمی مسخوطات اور تصاویر سے کی جاتی تھی اب کتابیں پریسوں میں ڈھلنے لگیں، ڈرائنگ روم اور گول کمروں میں جا بجا صرف فوٹو نظر آنے لگے، اس طرح خطاطوں اور مصوروں کو افلاس کا شکار ہونا پڑا، ان کا وجود برائے نام باقی رہ گیا۔ اب اگر رسم الخط کی تبدیلی عمل میں آئی تو یہ فن اور اس کے فنکار اور بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

با ایں ہمہ اردو کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنانے کی تجویز پھر بھی ایک قابل قبول تجویز ہو سکتی ہے، کم از کم اسے اختیار کرنے میں ادب اور علم کی کثرت تو نظر آتی ہے لیکن کیا ہمارا ادب ان علوم و فنون سے قطعاً محروم اور عاری ہے۔ اگر فی الحقیقت عاری ہے تو جب ہم اسے معقول سرمایہ کو ٹھکرا کر انگریزی کو اپنی قومی و سرکاری زبان بنانے کیلئے تیار نہیں تو پھر انگریزی کی بجائے رومن رسم الخط کی تائید کیوں کر کر سکتے ہیں؟ رومن ٹائپ کے مقابلے میں ہمارا عربی نسخ اور اردو نستعلیق اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ ہم اسے یکسر اور تمام تر ٹھکرا دیں۔

سابقہ اصلاحات کی روشنی میں اس میں مزید اصلاحات کی جا سکتی
ہیں۔

ہم اس خیال میں تھے کہ سوال صرف اردو رسم الخط
کا ہے لیکن تعلیمی کمیشن کے دوسرے اعلان سے پتا چلا کہ
نہیں، ہمارے سامنے بنگلہ کے لئے بھی رومن رسم الخط کی
تجویز زیر غور ہے۔ لیجئے ایک نہ شدہ دو شدہ۔ جو دوئی
ہمیں ہندوستان میں نہ بھائی آج وہی دوسرے روپ میں
ہمارے سامنے آئی۔ اگر یہ ہونی شدنی ہی بات ہے تو پھر
یہ صرف دو پر ہی کیوں ختم ہو۔ اور بھی تو چار بھائی
ہیں ان کا پانچواں سوار اور چھٹا سردار بھی ہے، آخر اس
دور جمہوریت میں وہ اس عنایت سے کیوں محروم رہیں۔
۱۹۵۱ء کی مردم شماری، تعداد خواندگی اور زبان کے
اعداد و شمار کی رو سے یہ سب منہ بولے بھائی جب ”رومن
ڈرل ماسٹر، کے سامنے کھڑے ہو کر ”لیفٹ رائٹ،، کریں گے
تو اپنے قد و قامت (بولی) کے اعتبار سے اس طرح کھڑے
ہوں گے :-

”بنگلہ، پنجابی، اردو، سندھی، پشتو، بلوچی، فارسی، عربی،“
اس پر ہم سیر حاصل تبصرہ تو آگے چل کر تعلیمی مسائل
کے ماتحت کریں گے یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ تعلیمی
کمیشن کے اس تازہ اعلان نے کم از کم اس گتھی کو تو
فوراً سلجھا دیا اور ہمارا یہ شک رفع ہو گیا کہ اگر یہ نوازش بیجا
فی الحقیقت ظہور میں آئی تو اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ
کی تقدیر بھی وابستہ ہوگی باقی رہا دوسری زبانوں کا مسئلہ،

ظاہر ہے کہ جلد یا بدیر آن کا اشیانہ بھی برق رومن کی نذر
 ہو جائیگا اردو اور بنگلہ کی طرح آن میں یہ تاب مقاومت
 کہاں؟

اردو، بنگلہ روسی رسم الخط (بظاہر دوسری زبانوں
 کو نظر انداز کرتے ہوئے) کا مسئلہ محض جمع یا تفریق کا
 سوال نہیں کہ جوڑنے یا گھٹانے کے بعد فوراً حل ہو جائے۔
 یہ تو ایک سعمہ ہے سمجھنے اور سمجھانے کا، ہمیں مختلف
 زاویہ ہائے نگاہ سے اس کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ
 سوچنا ہوگا۔ آئیے ہم علیحدہ علیحدہ عنوانات کے ماتحت
 اس پر کچھ غور و فکر کریں۔

پاکستان کے بنیادی نظریات

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

آہ شودر (۱) کیلئے ہندوستان غم خانہ ہے
درد انسانی سے اس بستی کا دل ویرانہ ہے

(اقبال رح)

سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھیں کہ زبان کے باب میں
ہمارا پاکستانی منشور کیا کہتا ہے یعنی پاکستان کی بنیادی
اساس کن نظریات پر قائم کی گئی تھی۔ قائد اعظم رح نے
اپنی زبان اور قلم سے بار بار کیا کہا تھا؟ قائد اعظم رح نے
قوم کو یہ قول دیا تھا کہ :

(۱) پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان واحد اردو ہوگی۔

(۲) اردو کے ذریعے تمام صوبہ جات کے باشندوں کو

متحد کیا جا سکتا ہے اس لئے اس کو پاکستان

کی قومی زبان قرار دیا جائے۔

(۱) بھارت کی نام نہاد سیکولر اسٹیٹ جس طرح 'شودروں،

کو نیچ ذات اور نجس سمجھتی ہے اسی طرح اس کی نگاہ میں

''مسلمان، قوم بھی سلچھ اور نا پاک ہے ۱۲ -

ظاہر ہے کہ جب یہ وعدہ کیا گیا تھا اُس وقت "اردو" رومن رسم الخط میں نہیں تھی بلکہ اپنے پیدائشی عربی رسم الخط سے ماخوذ اردو نستعلیق میں تھی اور اب تک ہے۔ قائد اعظم رح نے یہ قول کیوں دیا تھا۔ وقت کے تمام رہنما اس کے حامی، اور غیر منقسم ہندوستان کے مسلم عوام اس کے طلبگار کیوں تھے؟ اس لئے کہ گاندھی جی اپنی پرارتھناؤں میں لارڈ میکالے کا پڑھایا ہوا سبق اپنے چیلوں کو پڑھا رہے تھے۔ ان تمام صوبوں میں جہاں کانگریسی وزارتیں قائم تھیں، واردہا اسکیم، ودیا مندر اور ناگری پرچارنی سبھا کے منکھ بڑے زور شور سے پھونکے جا رہے تھے۔ ہندوستانی زبان کے پردے میں سنسکرت زبان اور دیوناگری رسم الخط کو از سر نو زندہ اور مسلمانوں کی زبان، مذہب اور تہذیب کی شدھی کی جا رہی تھی۔ مدارس میں لڑکے لڑکیوں کی تعلیم مخلوط ہو گئی تھی۔ تعلیمی نصاب میں مسلمانوں کی دینیات یکسر غائب تھی، تاریخ کو بھی مسخ کر دیا گیا تھا۔ ذریعہ تعلیم مادری و ملی زبان کی بجائے سنسکرت تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کیلئے موسیقی اور تصویر کشی عام تھی۔ فریضہ قربانی کو پاپ اور عقیدہ جہاد کو اہنسا سے بدلا جا رہا تھا۔ مسلمان بچے ہندو لڑکوں کے دوش بدوش سرسوتی کی پوجا اور 'بندے ماترم' کا گیت گاتے تھے۔ سلام کی بجائے نمستے اور رام جی کی جے ہوتی تھی۔ غذا میں صرف ترکیاری اور دال بھات ملتا تھا، گوشت بالکل غائب تھا۔ اسی طرح لباس میں کلاہ، ٹوپی اور پاجامے کی جگہ گاندھی جی کی کھدر کیپ اور دھوتیاں استعمال کرائی جاتی تھیں۔ اس

پہناوے سے لڑکوں میں ہندو اور مسلم کی تمیز قطعاً
مجال تھی -

ان حالات و واقعات سے متاثر ہو کر جب بابائے اردو
ڈاکٹر عبدالحق نے گاندھی جی سے ملاقات کی اور ان باتوں کی
طرف توجہ دلائی تو انہوں نے جواب دیا -

(۱) ”میں اردو کا اس لئے مخالف ہوں کہ وہ قرآنی
زبان میں لکھی جاتی ہے -

(۲) اردو (ہندوستانی باشندوں کی بجائے) مسلمان
بادشاہوں کی زبان ہے ، مسلمان چاہیں تو اسے باقی
رکھ سکتے ہیں لیکن ہندوستانی زبان ہندی ہی
ہوگی ، (قومی زبان از ڈاکٹر سیتا پوری صفحہ ۳)

ایک مرتبہ نیشنل کالج بہار میں مولانا سلیمان ندوی رح نے
فرمایا :

”مجھے بڑا تعجب آن لوگوں پر آتا ہے جو ہندی
اور اردو کو دو الگ الگ زبانیں تو کہتے ہیں
لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو جدا جدا قومیں
تسلیم نہیں کرتے ،“

(منشور، دہلی ۲ - مارچ ۱۹۴۶ء)

اس کے برعکس پنڈت نہرو نے کہا :

”یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا عربوں
ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں
کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کیوجہ سے اب تک

باقی ہے یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں،،

(سیری کہانی از نہرو صفحہ ۳۳۳)

اور جب سنسکرت کا پرچار کرنے کھڑے ہوئے تو یوں بولے :
 ” زبان اور رسم الخط کے درمیان بڑا گہرا رابطہ
 ہے خط کی تبدیلی اس زبان (سنسکرت) کیلئے بڑی
 اہمیت رکھتی ہے جسکا ماضی شاندار رہا ہو،،

اسی طرح سواسی ستیہ دیونے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں کہا :
 ” ہندوستان میں ہندو تہذیب ہی کے ذریعہ
 سوراج قائم ہو سکتا ہے دھرم کی روشنی میں
 ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کو دنیا سے نابود
 کر دیا جائے اور اس کی جگہ راشٹر دھرم کی
 تعلیم مسلمانوں کو دی جائے،،

(تیج، دہلی، ۲۰ - جون ۱۹۲۳ء)

حقیقت یہ ہے کہ ہندو قوم بہت پہلے سے بیدار تھی
 اور آج اس سے بھی زیادہ بیدار ہے، اسے اپنی قومیت کا
 احساس پہلے بھی تھا اور آج بڑی شدت کے ساتھ ہے۔ قومی
 تعصب کی اس سے زیادہ انتہا اور کیا ہوگی کہ آج بھارت
 کے مختلف شہروں میں سڑکوں محلوں کے ناموں کی بھی شدھی
 شروع ہو چکی ہے مثلاً دہلی میں ’ پھاٹک حبش خان، کا نام
 ’ تلک بازار، اور ’ سر سید احمد روڈ، کا نام ’ پرناب روڈ،
 رکھا گیا ہے خدا کا شکر ہے کہ ہم ایسے بے معنی تعصب
 اور سنگدلی کا شکار نہیں مگر اس حماقت سے قطع نظر یہاں یہ

عالم ہے کہ گیارہ سال تک احساس کمتری میں مبتلا رہے، ہمارے سابقہ سیاسی رہنماؤں نے کبھی انگریزوں کی جوتیاں اٹھوائیں، کبھی نہرو کو بڑا بھائی بنایا۔ کبھی پاکستان کے بنیادی نظریات کو ٹھوکر مار کر مخلوط انتخاب کی رٹ لگوائی، کبھی قوم و ملت کے مفہوم کی شدھی کی گئی۔ ہر سال قائد اعظم رح کا یوم پیدائش، یوم پاکستان اور یوم جشن آزادی بڑی دھوم دھام اور کروفر سے منائے جاتے ہیں، اخبار و رسائل میں بڑے زور دار آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ قائد اعظم رح کی آواز میں ان کے اقوال اور حکیم مشرق ڈاکٹر اقبال رح کے حکیمانہ درس خودی اور پیغام حریت کو ریڈیائی لہریں صبح سے رات تک نت نئے انداز میں کائنات کے ذرے ذرے کو سنا کر عمل کی تلقین کرتی ہیں، لیکن شب کو سونے سے پہلے یہ تمام اقوال اور پند و نصائح طاق نسیاں میں رکھ دی جاتی ہیں اور پوری قوم غفلت کی چادر تان کر سو جاتی ہے۔

ہندوؤں نے اردو زبان اور رسم الخط کو یہ کہہ کر کہ یہ قرآنی ہے، مسلمان بادشاہوں (ہندوستانی باشندوں کی بجائے) کے عہد غلامی کی نشانی ہے اسکی مخالفت کی اور آج سنسکرت زبان اور دیوناگری رسم الخط کو ہر حیلے اور ہر بہانے نافذ کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے عہد غلامی کی ایک یادگار زبان انگریزی تو ہم پر پہلے ہی سے مسلط ہے اور شاید آئندہ بیس برس تک مسلط رہے گی۔ اب ایک دوسری یادگار رومن رسم الخط کو اپنانے کی سوچ رہے ہیں اور پھر لطف یہ کہ الٹا ہم ہی کو لکیر کا فقیر بتایا جا رہا ہے۔

بہر حال اب ہمیں دیکھنا ہے کہ صدر اعظم پاکستان جنرل ایوب کے ان واضح اعلانات کو جو انہوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو رائٹرز کنونشن کراچی اور ۶ مارچ ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی کے جلسہ عام میں کئے تھے :-

”تعمیر وطن کے باب میں ادب کو نہایت اہم خدمت انجام دینا ہے، انہیں روح اسلام کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے تاکہ وہ اپنی منزل مقصود کو جلد از جلد پاسکیں۔“

ادیبوں کو چاہیے کہ وہ ادب میں پاکستانی نظریہ حیات کی تبلیغ پر توجہ دیں اور عوام میں تعمیری انداز فکر پیدا کریں۔

سیاست داں ہمیشہ کیلئے اس ملک سے ختم ہو چکے ہیں وہ اب کبھی برسر اقتدار نہیں آسکیں گے۔ نظریہ پاکستان کی بنیاد اسلامی ہے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل کئے بغیر ہم نہ اچھے انسان بن سکتے ہیں اور نہ اچھے پاکستانی۔

(جنرل ایوب)

ہمارے ارباب حل و عقد اور اہل فکر و نظر، ادباء اور شعراء کس طرح عملی جامہ پہناتے ہیں، آئیے اب ہم رسم الخط کے مذہبی پہلوؤں پر کچھ غور کریں۔

مذہبی روایات

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
اقبال رح

یہ صحیح ہے کہ زبان انسان کے خیالات و جذبات کی ترجمان ہے اور رسم الخط تحریر کا ذریعہ، لیکن یہ غلط ہے کہ زبان اور رسم الخط کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس نظریہ کے لئے قرآن مجید کی موجودگی ہی ایک نہایت مسکت جواب ہے، اگر یہ کہا جائے کہ نزول قرآن پاک سے قبل حضرت آدمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ پر جو صحائف آسمانی نازل ہوئے جنکی روشنی میں انجیل، توریت اور زبور ظہور میں آئیں کیا وہ مقدس اور قابل احترام کتب نہیں؟ یقیناً وہ بھی قابل احترام ہیں لیکن تمام تر قابل عمل نہیں کیونکہ ان مقدس کتب کا موجودہ روپ تحریف شدہ ہے، دوم یہ کہ اس وقت تک دین اسلام مکمل نہیں ہوا تھا، اگر مکمل ہو چکا ہوتا تو پیغمبر آخر الزماں حضرت صلعم اور قرآن مجید کے نازل ہونے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ اگر زبان اور رسم الخط کے درمیان کوئی رشتہ مذہب نہیں

ہے اور نہیں ہوتا تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال گذر جانے کے باوجود (ابتدائی اور جزوی ترمیمات سے قطع نظر) قرآن پاک کی زبان اور رسم الخط اب تک کیوں نہیں بدلا۔ ان تیرہ سو برس میں دنیا کے ہر ملک اور ہر گوشے میں قرآن مجید کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا اور سیکڑوں تفسیریں لکھی گئیں لیکن کلام الہی کا متن اسی رسم الخط میں رہا جو اُس کا قدیم مہذب خط تھا۔

فی زمانہ ترکوں کے قول و فعل کو بلاوجہ ضرورت سے زائد سراہا جاتا ہے اور ہر لمحہ اور ہر گام پر ان کی مثال دی جاتی ہے۔ (۱۸۵۷ء) کے ہنگامہ آزادی کے بعد بر اعظم ایشیا کے طول و عرض میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغ عیسائیت کا بڑا زور شور تھا اور مسلمان قدرتاً اس سے بہت متفکر تھے، عیسائیت کے ان حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے وہ بھی اپنی سی سر توڑ کوششیں کر کے نہ صرف اپنا دفاع کر رہے تھے بلکہ جوابی حملوں میں بھی پیش پیش تھے۔ گارساں دتاسی اپنے خطبات میں ان کوششوں کے متعلق اس طرح لکھتا ہے :

”انگریز مشنریوں کو ہندوستانی مسلمانوں میں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جتنی ان کو ترکی میں حاصل ہوئی ہے۔ بہر حال ان کے اثر سے ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کا خیال پیدا ہو گیا ہے،“

خطبہ ۱۸۶۴ء صفحہ (۴۴۴)

”انگریزی لے ہندوستانی لوگوں کو ذرا نہیں
 بھاتی، بعض مشنری یہ کوشش کر رہے ہیں کہ
 ہندوستانی راگوں کے مطابق اپنی دعاؤں کو ادا
 کریں۔۔۔۔ چنانچہ ہندوستانی راگوں کو جو
 قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں یورپین علامات
 میں لکھ لیا گیا ہے۔“

خطبہ ۱۸۶۳ء صفحہ (۴۰۰)

ایسی نازک صورت حال میں جب کہ تحریر و تقریر کے
 علاوہ راگ رنگ کے ذریعے بھی لوگوں کو عیسائیت کی طرف
 گھسیٹا جا رہا تھا قرآن مجید کے معاملہ میں گارساں دتاسی کے
 بقول ترکوں کا اعتقاد اور مطالبہ یہ تھا:

”دولت عثمانیہ کے ترکوں کو یہ زبردست
 اعتراض تھا کہ قرآن مجید جیسی مقدس کتاب کا
 اس وقت کی مروجہ زبان ترکی میں ترجمہ کیا
 جائے لیکن بہر نوع سلطان کے حکم سے وہ
 ترجمہ شائع ہوا،“

خطبہ ۱۸۶۶ء صفحہ (۵۳۳)

ابھی ماضی قریب میں جب ترکی میں یہ تحریک اٹھی اور شائد
 اب بھی اس پر عمل ہو رہا ہے کہ اذان اور خطبات رسول صلعم
 ترکی زبان میں ادا کئے جائیں تو اس کے برخلاف تمام عالم
 اسلامی بینک وقت چپخ اٹھا۔ اس اذان اور خطبہ کی خواندگی
 میں تو رسم الخط کا دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ لہذا

یہ کہنا کہ زبان اور رسم الخط کا کوئی مذہب نہیں ہوتا
کہاں تک حق بجانب ہے۔ یہ انگریزی تہذیب، انگریزی
زبان اور رسم الخط کے کرشمے نہیں تو اور کس کے ہیں؟
مفتی اعظم فلسطین نے کراچی کے ایک پرائیویٹ
جلسے میں فرمایا :

”میں نے ملک شام میں ایک جگہ ایک نمائش گاہ
میں چند خرگوشوں کو دیکھا ان میں سے
ایک خرگوش دوسرے خرگوش کو مار مار کر
اپنے گھر سے نکال رہا تھا۔ میں نے اس کے
محافظ سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب
دیا کہ مارنے والا خرگوش اعلیٰ نسل سے ہے
اور دوسرا کمتر نسل کا، اس اعلیٰ نسل والے
کو کمتر نسل کی قربت پسند نہیں،“

یہ چشم دید واقعہ سنا کر مفتی اعظم نے اہل محفل سے کہا
جس میں یہ راقم الحروف بھی شامل تھا :

”صاحبو! دیکھئے حیوانات تک میں نسل کی برتری
اور کمتری کا احساس موجود ہے، ہم اشرف المخلوقات
اور اشرف الامت ہوتے ہوئے بھی اس احساس سے
بے بہرہ ہیں، میں حیران ہوں کہ ہم لوگ کس
طرح اپنے بچوں کو کلیسائی مدارس میں بے تکان
بھیج دیتے ہیں اور پھر ان کے لامذہب اور بے دین
ہونے کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔“

یہ تبصرہ برصغیر ہند و پاک کے کسی دقیقا نویسی کٹ ملا کا نہیں، تمام سماجک اسلامیہ کے مسامحہ مفتی اعظم کا ہے، لیکن ہم ترکی تہذیب پر اعتراض کر نیوالے کون؟ ہمیں سمندر پار ایک پرائے گھر کی معاشرت سے کیا واسطہ، اور اگر اسلامی نقطہ نظر سے ہمیں تنقید کا کوئی حق پہنچتا ہے تو ہمیں چاہئے کہ پہلے ہم اپنے گریبان میں سند ڈال کر دیکھیں کہ ہمارا اپنا مذاق اور شوق و رجحان کیا ہے۔ مغرب کی تقلید نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

آج کے مغرب زدہ والدین کو جنہیں محض نام کے اعتبار سے مسلم ہونے کی سند حاصل ہے اپنے بچوں سے اپنے آپ کو ابا یا آبا اور اماں یا آسی سنکر شرم آتی ہے، اس کی بجائے ڈیڈی، یا مسمی، سنکر خوش ہوتے ہیں، اسی طرح چچا اور چچی کو انکل اور آنٹ کہلوا یا جاتا ہے، بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ان معصوم اور سادہ لوح بچوں کو مغربی لباس پہنا کر گانے اور ناچنے کی تعالیم دلوا کر باقاعدہ مشق کرائی جاتی ہے اور جب یہ بچے اپنے ماں باپ اور عزیزوں کے روبرو تھرک تھرک کر ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار، یا کوئی تازہ فلمی نغمہ الاپتے ہیں تو گھر والوں کی باچھیں خوشی سے کھل جاتی ہیں، تالیاں بجا بجا کر چیئرز دیتے ہیں۔ پھر یہی بچے بڑے ہو کر نامحرموں کے ساتھ ڈرنک اور ڈانس کرتے ہیں۔ شادی سے پہلے علی الاعلان کورٹ شپ مناتے ہیں۔ اسے

انکی فطری آزادی اور شخصی حق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ موڈرن مسلمان اسلامی تہذیب کے منہ پر یہ کہہ کر طمانچہ لگاتے ہیں: ”دیکھو یہ ہے ہماری موڈرن تہذیب کا اعلیٰ شاہکار“ مولانا ظفر علیخاں مرحوم کو نہ معلوم کیا سوجھی ایک مرتبہ بہت ہی بری طرح بگڑ بیٹھے اور جھنجھلا کر فرمایا:

تہذیب نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر

کہ اس حرمزادی کا حلیہ بگاڑ دے

کہا جاتا ہے کہ مصطفیٰ کمال نے رجعت پسند ملائیت کا خاتمہ کر دیا۔ بلاشبہ ایسا ہوا لیکن اس کی قاطع رسم الخط کی تلوار نہ تھی بلکہ وہ سقوط خلافت عثمانی تھا جو شہنشاہیت، آمریت اور استبداد کی شکل میں بنو امیہ اور بنو عباسیہ سے منتقل ہو کر آل عثمان میں آیا تھا اُس وقت کی سیاسی بازی گری نے حجاز، عراق اور مصر کو خود مختار بنا کر مسند خلافت کی تیرہ سو سالہ شوکت و ہیبت کو پہلے ہی سے ختم کر دیا تھا۔ چار و ناچار مصطفیٰ کمال نے بھی (۱۹۲۴ء) میں اُس پر سقوط کی قانونی مہر ثبت کر کے یہ اعلان کر دیا کہ ہم پہلے ترک ہیں اور بعد میں مسلمان۔ چنانچہ آج بھی ترکوں کا یہی نعرہ ہے۔ ڈاکٹر اقبال رح نے اسی سقوط خلافت پر تو فرمایا تھا:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

در اصل ترکی جغرافیائی اعتبار سے یورپ سے بہت قریب ہے، دوسرے یہ کہ ترکی زبان کے حروف تہجی میں کوئی حرف ایسا نہیں جس کا لاطینی ابجد میں وجود نہ ملتا ہو لیکن اس قربت اور مماثلت کے باوجود رومن رسم الخط اختیار کرنے پر ترکی زبان کو دیگر بلاد عالم میں فروغ تو کجا بر صغیر ہند و پاک میں بھی آج تک کوئی نہیں جانتا، یہاں کے عوام تو الٹا یہ کہتے ہیں : ع

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس کے برعکس جس طرح عربی رسم الخط نے پہلوی زبان کی ظاہری صورت و شکل اور ایرانیوں کے مزاج اور روح تک کو بدل ڈالا، اسی طرح لاطینی رسم الخط کی بدولت آج کا ترکی اپنے تمام صحافتی اور ثقافتی سرمایہ سے محروم ہو کر مغربی تہذیب و تمدن کا شکار ہو گیا۔ مادی اعتبار سے بھی ترکی نے صنعت و حرفت میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی اور ممالک کا تو ہم کو علم نہیں لیکن ہمارے پاکستان میں ترکی ساخت کی ایک معمولی پنسل یا بلیڈ تک نہیں ملتا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر ہم نے رومن رسم الخط اختیار کر لیا تو بہت سے ممالک پاکستان کے ہمنوا ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہندوستان کی تقسیم ہی ظہور میں کیوں آتی۔ بھارتی لیڈروں نے مذہبی اساس ہی پر تو یہ کہا تھا کہ اردو زبان اور اسکا رسم الخط مذہبی اور قرآنی ہے اور سنسکرت اور دیوناگری رسم الخط دیوتاؤں کی زبان اور

تحریر ہے۔ بھارت بھی تو ہماری طرح امن اور اتحاد کا علمبردار ہے پھر وہ اپنی قدیم زبان اور رسم الخط آج کیوں وائج کر رہا ہے، رومن رسم الخط کیوں اختیار نہیں کرتا؟ باقی رہے ممالک اسلامیہ جہاں عربی رسم الخط کے علاوہ لاطینی کا بھی رواج ہے تو کیا وہ لاطینی رسم الخط کی وجہ سے ہمارے ہم خیال اور ہم نوا ہیں اور ہمنوا ہو جائیں گے، یا اسلامی رشتہ اخوت کے لحاظ سے ہمارے بھائی کہلاتے ہیں اور ہمارے بھائی بن سکتے ہیں۔ اسلامی مملکت مصر کو لیجئے جہاں عربی نسخ میں اس کا ٹائپ اور ٹیلی پرنٹر دونوں موجود ہیں، وہ ہمارے ہم مذہب بھی ہیں لیکن اس کے باوجود کایتاً ہم سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ان اسلامی ممالک کے لئے قرآن مجید کی تعلیم اور عربی رسم الخط کی دلیل دی جاتی تو واقعی سمجھ میں آنے والی بات بھی تھی کہ اسکا پڑھنا لکھنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا دنیا کے ہر مسلمان کا بنیادی اور یکساں فریضہ ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ قرآن پاک کی عظمت اور احترام فی الاصل اس کے اصول اور احکام ماننے میں ہے لیکن یہ بات صرف اسی حد تک درست ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان احکام کا اس وقت کیا حشر ہوگا جب آپ سرے سے قرآنی زبان اور رسم الخط ہی کے منکر ہو جائیں اور آپ کا مطالبہ یہ ہو کہ ہم تو رومن رسم الخط ہی میں کلام الہی پڑھیں گے۔ رسم الخط اس لئے بحث میں آتا ہے کہ وہ زبان (جو کام و دھن کی اصوات

کا نام ہے) کی ادائیگی کا واحد ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ موجودہ اعراب اسی لئے وجود میں آئے کہ ان کے بغیر قرآن مجید کا صحیح تلفظ ادا کرنا دشوار تھا۔ ان اعراب یا تلفظ کی غلطی بعض اوقات کفر کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ رومن رسم الخط اس کی صحت کے لئے قطعاً ناموزوں ہے۔ قرآن مجید یا عربی زبان ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کی ہر زبان کا یہی حال ہے۔ اپنے ملک کی زبان بولنے والا دوسرے ملک کی زبان کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہے، کیونکہ قدرتی طور پر آب و ہوا کے اختلاف کے باعث ہر انسان کے عضلات دھن جدا جدا اصوات، لب و لہجہ اور تلفظ رکھتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا قرآن پاک تو ایک ہی ہے لیکن ہر زبان میں اس کے تراجم اور تفاسیر الگ الگ ہیں۔ آج اردو میں اسلام پر جس قدر کتابیں موجود ہیں شاید عربی فارسی میں بھی اتنی نہ ہوں گی ان تراجم کی بوقلمونی اور تفاسیر میں تاویلات کی نیرنگی نے ہمارے درمیان مشہور ۷۲ فرقوں کو جنم دیا اور تفرقے پھیلانے۔ حضرت اقبال رح نے کیا خوب فرمایا ہے :

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر

تاویل سے قرآن کو بنادیتے ہیں پاژند

اب اگر ان تراجم اور تفاسیر کو رومن رسم الخط میں تبدیل کیا گیا اور کرنا پڑے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لکھا ہوا کچھ اور ہوگا اور پڑھا کچھ اور جائیگا۔ اس طرح

قرآن مجید کے سیکڑوں مفہوم اور مطالب ہو جائیں گے اور یہ فرق نئے ۷۲ فرقوں اور ہزاروں فتنوں کو پیدا کرے گا۔ دین محمدی ص ایک کھلونا بن کر رہ جائیگا اسی لئے تو آنحضرت صلعم نے عالمگیر قومیت کیلئے ہر چیز میں یکتائی اور وحدت کا جلوہ پیش کیا ورنہ اسلام کا بول بالا کیونکر ہوتا۔ اگر یہ کم ہاجائے کہ رومن رسم الخط کو اصلاح کے بعد رائج کیا جائیگا تو کیا اردو رسم الخط میں اصلاح کرنا کوئی عیب یا گناہ ہے؟

تعلیمی مسائل

اور یہ اہل کاپیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اقبال رح

یہ ہمارا روز مرہ کا عینی مشاہدہ ہے کہ جب کسی مسلمان گھر میں کوئی نو مولود ہوتا ہے تو بطن مادر سے پیدا ہوتے ہی اس کے کانوں میں اذان دیجاتی ہے۔ اس سرگوشی میں سب سے پہلے جو آواز نو مولود کے کانوں میں باقاعدہ داخل ہوتی ہے وہ لفظ ”اللہ“ ہوتا ہے، زمانہ پرورش میں بھی اسے ”اللہ اللہ“ کی لوریاں دے کر دودھ بھری کٹوریاں پیش کی جاتی ہیں۔ پھر اس کی تعلیم کا آغاز بھی قرآن مجید کی آیت ”اقرا باسم ربک الذی خلق“ ہی سے ہوتا ہے۔ اسی اسلامی عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد بھی ہماری زبان عربی ہوگی۔

اس تمہید سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم آپ کے روبرو عہد قدیم کے اسلامی یا غیر اسلامی سکاتیب کی پوری تاریخ دھرائیں، مدعا صرف یہ ہے کہ اگر یہ تعلیم لازمہ اول اور فریضہ مذہبی نہ ہوتا تو مسلمان بچوں کے ابتدائی دوچار سال قرآن مجید یا عربی خواندگی میں کیوں صرف ہوتے

اور وہ دوسری اقوام سے تعلیم میں نسبتاً کیوں پیچھے رہتے۔ یوں تمام دنیا میں ناخواندہ موجود ہیں، کہیں کم، کہیں زیادہ اور کہیں بہت زیادہ۔ ابتدا میں بچہ ہو یا ناخواندہ بالغ اسے صرف حرف شناسی اور صحیح تلفظ ادا کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے پھر الفاظ کے معنی کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ گویا تلفظ سے کسی وقت اور کسی حالت میں بھی سفر نہیں۔

ماہران تعلیم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ بچے اور ناخواندہ بالغان اپنی مادری زبان بہت جلد سیکھ جاتے ہیں لیکن جب انہیں اپنی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبان کی تعلیم غیر زبان میں دی جاتی ہے تو ان کے دل و دماغ پر دوگنا بار پڑتا ہے۔ اس مثال سے ہم باآسانی اس عظیم دشواری کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جو ایک محض اجنبی اور ناآشنائے زبان کو کسی غیر زبان کی تعلیم دینے میں پیش آتی ہے، بس یوں سمجھئے جیسے کسی گونگرے پر عمل جراحی کر کے اسے گویائی بخشنا۔ چنانچہ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں بھی یہ خرابی موجود ہے کہ ابتدا میں اردو، درمیان میں انگریزی (جسے مقام تو نمایاں حاصل ہے لیکن انتظام معقول نہیں) اور میٹرک کے بعد تمام تر انگریزی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس بنیادی کمزوری کے باعث ۸۰ فیصد طلباء صرف انگریزی میں فیل ہوتے ہیں۔ ان کو صحیح معنوں میں کسی ایک زبان پر بھی دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ جہاں تک ہماری اپنی زبان کے تلفظ کا تعلق ہے تو کسی ناخواندہ یا زبان داں سے

(روزمرہ اور مخصوص محاوروں کو چھوڑ کر کہ وہ اسکی
لا علمی یا کم علمی کی دلیل ہے) تلفظ کی اس قدر غلطیاں
نہیں ہوتیں جسقدر دوسری زبان کے الفاظ ادا کرنے میں اس
سے سرزد ہوتی ہیں۔

انگریزوں کا اردو تلفظ اسی لئے غلط ہوتا ہے کہ وہ
آسے رومن رسم الخط کے ذریعے سیکھتے ہیں، اگر آپ کسی
مستند انگریزی لغت کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو ہر لفظ
کے ساتھ اس کا صحیح تلفظ ٹکڑوں میں لکھا ہوا نظر آئیگا۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ رومن رسم الخط تلفظ کی ضمانت اور کفالت
نہیں کرتا ہر زبان کے حروف ابجد مقرر ہیں جن کے ذریعے
با آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا لفظ کس زبان کا
ہے۔ رومن املا میں تمام حروف مخلوط ہو جانے کے باعث
زبان کی تمیز مفقود ہو جاتی ہے لہذا ایسی صورت میں کسی
لغت کا انتخاب بھی ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں خود انگریزی
زبان میں الفاظ کے ہجے اور اصوات حروف کا فرق عظیم بجائے
خود ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لئے انگریزی
میں کرئی مخصوص قاعدہ مقرر نہیں بلکہ آسے ایک ضابطے
کی حیثیت حاصل ہے اور پھر اس میں بھی آئے دن تغیر و تبدل
ہوتا رہتا ہے جسکا ثبوت وہ ضمیمے میں جو مستند نئی لغات
میں شامل کئے جاتے ہیں۔

آنجنہانی برنارڈ شاہ نے انہی دشواریوں کے پیش نظر
اپنی زندگی میں کافی غور و خوض کے بعد تقریباً سات سو الفاظ
وضع کر کے ماہرین السنہ انگریزی کے حوالے کئے تھے اور

یہ رائے دی تھی کہ ان مجوزہ الفاظ کی اساس پر انگریزی زبان کی از سر نو تشکیل کی جائے۔ اس مشورے میں یہ ہدایت بھی شامل تھی کہ مستقبل میں ہر آواز کے لئے ایک مستقل حرف ایجاد کیا جائے۔ مرنے کے بعد جب برنارڈ شاہ کا وصیت نامہ سامنے آیا تو اس میں بھی قوم کے نام یہی وصیت درج تھی۔ چنانچہ ایک مدت سے ماہران السنہ انگریزی کی ایک جماعت انگریزی ابجد اور اپنا نیا رسم الخط رائج کرنے کیلئے غور و فکر کر رہی ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ عنقریب ایک دو سال ہی میں برآمد ہونے والا ہے۔ اب ذرا ہمارا پرواز خیال و شوق ملاحظہ ہو کہ ہم اپنے مرصع، مہذب اور مکلف خط سے آنکھیں پھیر کر صدہا برس کے آس رومن رسم الخط کو آج ایسے وقت اپنانے کی سوچ رہے ہیں جب کہ آس کا تابوت نکلنے والا ہے۔ ترقی معکوس شاید اسی کو کہتے ہیں۔ اس سے تو ہزار درجہ یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنی تمام ملکی زبانوں اور رسوم الخط کو "اٹلانٹک اوشن"، میں غرق کر دیں اور انگریزی کو اختیار کر لیں، ورنہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ ہم اپنے خط میں اپنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے ماتحت ضروری اصلاحات کر کے آسے اپنی مرضی کے مطابق پہلے سے زیادہ آراستہ کر لیں۔

رومن رسم الخط کے نقائص اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ انہیں با آسانی شمار کیا جاسکتا ہے یہاں ہم صرف انہیں نقائص کو پیش کریں گے جن کا تعلق زیادہ تر ہمارے تعلیمی مسائل سے ہے :-

(۱) ہندی اور لاطینی حروف بائیں سے دائیں اور چینی اوپر سے نیچے کی طرف لکھے جاتے ہیں، یہ عمل قانون فطرت کے خلاف ہے۔

(۲) السنہ عالم کے الفاظ کی ایک تمہائی تعداد ماہرین السنہ کی استفہ رائے کے مطابق صرف اصوات کی مرہون منت ہے لہذا اگر رومن رسم الخط اختیار کیا گیا تو عربی، فارسی، اردو اور ہندی الفاظ کے تلفظ کا صوتی حسن داغدار اور معنوی تنوع یکسر غارت ہو جائے گا اور یہ لسانی اعتبار سے ایک زبردست المیہ ہوگا۔

(۳) اردو کے مقابلے میں رومن روانی کے ساتھ پڑھنے کے لئے ایک مدت درکار ہوگی۔

(۴) اردو میں ہر لفظ حروف تمہجی کے قواعد پر لکھا جانا ہے۔ ہر شخص ایک ہی ہجے لکھے گا اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

(۵) رومن کے مقابلے میں اردو حروف کم جگہ لیتے ہیں، اردو شارٹ ہینڈ کا درجہ بھی رکھتی ہے اس کا علم بھی اردو میں موجود ہے۔

(۶) تمام کتب بالخصوص درسی کتابوں کا حجم بڑھ جائے گا۔ حجم کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں اضافہ ہوگا اسی اضافے کی بدولت کتابوں کی قیمت کم از کم ڈیوڑھی یا دوگنی ہو جائے گی۔

(۷) تعلیمی نصاب میں خوشخطی کا بھی ایک خاص مقام ہے، اس کی معراج خطاطی ہے اور اس کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ یہ بھی بالکل نیست و نابود ہو جائے گی۔

(۸) پرائمری جماعتوں کے اساتذہ اور طلباء دونوں کو پہلے انگریزی اور رومن رسم الخط کی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے بعد عربی، اردو یا انگریزی پڑھانے اور پڑھنے کی نوبت آئے گی، اس طرح طالب علم کی ابتدائی عمر کا بیشتر حصہ برباد ہو جائے گا۔ اگر قرآن مجید کی تعلیم علیحدہ دی گئی تو وہ زمانہ علیحدہ رہا۔ علاوہ ازیں انگریزی پڑھ لینے کے بعد رومن رسم الخط کی حیثیت اور ضرورت کیا باقی رہتی ہے۔

(۹) اردو زبان میں قریب قریب تمام زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ ہماری زبان میں صرف تین حروف علت ہیں، تمام حروف کا تانا بانا انہی حرکات ثلاثہ پر موقوف ہے۔ اس کے برعکس انگریزی حروف علت پانچ ہیں۔ اصوات کو واضح کرنے کے لئے رومن رسم الخط میں مزید علامات اور نئی علتیں اختیار کرنی پڑیں گی پھر بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہماری ضروریات کے لئے کافی ہوں گی یا نہیں لہذا رومن رسم الخط اختیار کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی تمام زبانوں کو بگاڑ کر ان کا روپ کھودیں۔

(۱۰) تمام ممالک کی رائج الوقت زبانوں کی لغات کو رومن رسم الخط کی بنیاد پر از سر نو مرتب کرنا پڑے گا اس لحاظ سے مختلف علوم و فنون کی جو اصطلاحات اردو قالب میں اب تک ڈھل چکی ہیں اور ڈھل رہی ہیں زندہ درگور ہو جائیں گی۔ وہ اردو قاموس اور

عالمگیر اردو لغت جسے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اور آکسفورڈ ڈکشنری کے پیمانے پر لاہور اور کراچی میں ترتیب دیا جا رہا ہے محض ایک دفتر بے معنی ثابت ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر اس 'ترقی' اردو بورڈ، 'اردو ٹرسٹ'، 'اقبال اکیڈمی'، اور دیگر نیم سرکاری علمی اداروں کے قیام اور ان پر قوم کا لاکھوں روپیہ صرف کرنا کہاں تک جائز اور سودمند ہو سکتا ہے۔

• ہماری تعلیمی پستی کی واحد وجہ ہمارا ناقص نظام تعلیم ہے اور اس نظام تعلیم میں انگریزی سب سے بڑا سنگ راہ ہے۔ ہمارے ارباب حل و عقد ہمیشہ سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں اور آج بھی بڑی آزادی اور بے فکری کے ساتھ اردو کے خلاف یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ اردو ابھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اول تو یہ دعویٰ ایک بہت بڑی حد تک غلط ہے اور اگر اتمام حجت کے لئے ہم اسے بادل ناخواستہ تسلیم بھی کر لیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت نے اسے اس قابل بنانے کی سرکاری پیمانے پر کبھی کوئی کوشش بھی کی۔ کبھی عوام کی ان کاوشوں کو بھی سراہا جو اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے محدود ذرائع سے اس کی ترقی اور نشو و نما کے لئے کر رہے ہیں اور شب و روز اسی میں منہمک ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ روسن رسم الخط کی وجہ سے اردو اور ہنگامہ کا جھگڑا سٹ جائے گا یہ اردو اور ہنگامہ کا جھگڑا بھی عوام کا پیدا کردہ نہیں بلکہ سابقہ سیاسی حکمرانوں کا ہے۔

انہوں نے اپنے اقتدار اور نفع کی خاطر یہ تفرقہ ڈالا تھا۔ عوام چاہتے تو مشرقی پاکستان کو جو اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے پہلے ہی سے علیحدہ ہے سیاسی طور پر بھی پاکستان کے دو ٹکڑے کر ڈالتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور نہ کبھی ایسا ہوگا۔ اگرچہ یہ کوئی خوبی کی بات نہیں لیکن بعض اوقات بدرجہٴ مجبوری ایک ملک میں دو سرکاری زبانیں بھی ہو جاتی ہیں اگر یہ خیال ہے کہ رومن رسم الخط اردو کو ختم نہیں کر سکتا، اردو کی حیثیت باقی رہیگی تو پھر اسی نظریہ کے ماتحت بنگلہ بھی رومن رسم الخط میں آجانے کے بعد بنگلہ ہی رہے گی۔ لہذا اردو اور بنگلہ کا اگر کوئی جھگڑا موجود ہے تو وہ رومن رسم الخط اختیار کرنے کے بعد بھی جوں کا توں باقی رہے گا۔ اور یہی صورت پاکستان کی باقی ماندہ زبانوں کی ہوگی۔

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی روشنی میں اندازہ لگائیے کہ اردو اور بنگلہ کی ترقی تو ایک طرف رہی ہماری مجموعی جہالت کو دور کرنے کے لئے ہماری سابقہ حکومتوں نے ہماری تعلیمات پر کس قدر توجہ کی اور ہم میں سے کتنوں کو تعلیم یافتہ بنایا :-

آبادی

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

مسلمان تعداد

مغربی پاکستان میں : 3,27,32,000

مشرقی پاکستان میں : 3,22,27,000 کل 6,49,59,000

کاسٹ ہندو تعداد

مغربی پاکستان میں : 1,62,000

مشرقی پاکستان میں : 41,87,000 کل 43,49,000

شیڈول کاسٹ تعداد

مغربی پاکستان میں : 3,69,000

مشرقی پاکستان میں : 50,52,000 کل 54,21,000

عیسائی تعداد

مغربی پاکستان میں : 4,34,000

مشرقی پاکستان میں : 1,07,000 کل 5,41,000

5,72,000

دیگر اقوام ممالک غیر :

7,58,42,000

پاکستان میں موجود زبانیں اور ان کا رسم الخط

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

کل پاکستان	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	رسم الخط	زبان	نمبر
4,12,91,989	4,12,80,220	11,769	دیوناگری	بنگالی	۱
2,14,66,815	8,533	2,14,58,282	اردو	پنجابی	۲
54,19,131	4,63,160	49,55,971	اردو	اردو	۳
43,59,287	8,349	43,50,938	نسخ	سندھی	۴
35,89,626	3,081	35,86,545	نسخ	پشتو	۵
13,77,567	5,50,206	8,27,361	لاطینی	انگریزی	۶
10,75,999	429	10,75,570	نسخ	بلوچی	۷
2,27,275	25,454	2,01,821	اردو	فارسی	۸
65,043	41,218	23,825	نسخ	عربی	۹

ان سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں کل پاکستان میں با اعتبار بولی بنگالی زبان بولنے والوں کی تعداد ۳ کروڑ ۱۲ لاکھ ۹۱ ہزار ۹۸۹ یعنی تقریباً نصف ہے، باقی نصف آبادی نقشہ کے مطابق دوسری زبانیں بولتی ہے جس میں انگریزی چھٹے نمبر پر آتی ہے، انگریزی بولی بولنے والوں کی تعداد کل ۱۳ لاکھ ۷۷ ہزار ۵۶۷ ہے۔

جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے اسکا انحصار ہمارے معیار خواندگی پر ہے، آئیے ہم دیکھیں کہ (۱۹۵۱ء) میں ہمارا معیار خواندگی کیا تھا۔

(۱)

پاکستان کا معیار خواندگی 'بحیثیت مجموعی'

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

تعداد	مرد
33,05,016	مغربی پاکستان میں :
99,00,362	مشرقی پاکستان میں :
کل 65,95,346	

تعداد	عورت
17,97,418	مغربی پاکستان میں :
40,57,651	مشرقی پاکستان میں :
کل 22,60,233	
کل خواندہ مرد و عورت : 1,39,58,013	

(۲)

پاکستان کا معیار خواندگی، ریاستوں اور
صوبجات میں

(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے)

ہزاروں میں

صوبہ یا ریاست	اوسط آبادی	اوسط خواندگی
مشرقی پاکستان	16.9	71.08
پنجاب	10.2	19.28
ریاست بہاولپور	6.0	1.10
صوبہ سرحد شمال مغربی	7.8	2.51
” قبائلی	1.3	.33
سندھ	10.8	5.02
ریاست خیرپور	8.8	.28
بلوچستان	8.2	.51
ریاستہائے بلوچستان	2.2	.12
کراچی	31.3	3.51
کل پاکستان		103.74

اسی ضمن میں ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مختلف ممالک کی حکومتیں اپنی قومی تعلیم پر کس قدر خرچ کرتی ہیں اور ان کے مقابلے میں ہماری سابقہ حکومتوں نے اس معاملہ میں کتنی دریا دلی سے کام لیا تھا یہ موازنہ صرف چند ممالک کے اعداد و شمار پر مشتمل ہے :

امریکہ	اپنی آمدنی کا	۱۶	فیصد	اپنی تعلیم پر خرچ کرتا ہے -
جرمنی	”	۱۵	فیصد	”
جاپان	”	۱۴	فیصد	”
روس	”	۱۱	فیصد	”
بھارت	”	۷	فیصد	”
پاکستان	”	۵	فیصد	”

ہماری آمدنی کے مقابلہ میں یہ ۵ فیصد صفر کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے ہماری اوسط خواندگی صرف ۵ فیصد ہے جبکہ دوسرے ممالک کی اوسط خواندگی ۹۰ فیصد تک پہنچتی ہے، کیا یہ صورت حال انتہائی افسوسناک اور قابل اصلاح نہیں؟

آئیے اب ہم رسم الخط کے زواہ نگاہ سے ان اعداد و شمار پر غور کریں۔ ان اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام پاکستان میں نوشت و خواند (اعلیٰ و ادنیٰ تمام زبانوں میں) سے واقف کل ایک کروڑ ۳۹ لاکھ ۵۸ ہزار اور ۱۳ مرد و عورت ہیں، جن میں تقریباً نصف کروڑ دیوناگری اور باقی اردو نشتعلیق اور عربی نسخ رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ آخر الذکر نصف تعداد میں انگریزی

لکھنے پڑھنے والے بھی شامل ہیں جن کی تعداد انگریزی بولی کی بنیاد پر کل مغربی و مشرقی پاکستان میں صرف ۱۳ لاکھ ۷۷ ہزار ۵۶۷ ہے۔ مانا کہ ان تقریباً ۱۳ لاکھ نفوس کا دن رات اور ہنا اور بچھونا گو انگریزی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی جانب سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عربی نسخ اور اردو نستعلیق سے قطعی نا آشنا یا مستغنی ہیں اور اگر ہوں بھی تو انکی تعداد اس قدر قلیل ہوگی جو ناقابل اعتنا ہے لہذا اس لحاظ سے ساڑھے سات کروڑ کی آبادی میں صرف ۱۳ لاکھ اشخاص انگریزی زبان اور لاطینی رسم الخط کے خواہاں اور دلدادہ ہیں۔ کیا ہمارے انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ صرف ان ۱۳ لاکھ باشندوں کی خواہش کو مان کر سوا سات کروڑ (مغربی و مشرقی) یا سوا تین کروڑ مغربی پاکستانیوں کے مطالبہ کو حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیا جائے۔

صرف اس لئے ہمارے سابقہ انگریزی آقا اور ان کے ہم نژاد ہم مسلک امریکی خداوندان نعمت مختلف منصوبوں کے ماتحت تھوڑا یا بہت کچھ دے رہے ہیں اور کچھ دے کر ہم سے ہمارا مذہب، ہماری تہذیب، ہماری زبان، ہماری ثقافت اور ہمارا سب کچھ در پردہ اپنی حکمت عملی سے لے لینا چاہتے ہیں۔ تاکہ انکی شہنشاہیت اور سامراجیت ہمیشہ کیلئے ان کے حق میں محفوظ ہو جائے، ہم ان کے اشاروں پر ناچتے اور تھرکتے رہیں، آخر کیوں؟

اے طاثر لاهوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
(اقبال رح)

قدرت نے اسلام کی فطرت میں لچک دی ہے جتنا
اسے دبایا جائے گا اتنا ہی یہ ابھرے گا۔ اقبال رح اپنی
کشت ویراں سے نا امید نہ تھا۔ وہ دانائے راز اس علت اور
حقیقت سے واقف تھا کہ حکومت کے زائد لگان، زمینداری کی
اجارہ داری اور ظلم نے اس مٹی کی نمی کو چوس کر اس کی
زرخیزی کو لوٹ لیا ہے۔ اب ایقان کا آپ نے خود مشاہدہ
کر لیا کہ جب 'ساقی' نے توجہ کی، اپنے فیض عام کو
ہر ایک کے لئے بقدر ظرف و جام مقرر کیا تو اس کی نمی
عود کر آئی۔ اب زرخیزی سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ جب
صدیوں کی یہ سنگلاخ داروگیر آن کی آن میں سٹ گئی
تو رسم الخط اور اس منہ بولی، بولی کا معاملہ تو اپنے دل کا
معاملہ ہے ایک ہی نظر اور ایک ہی بول میں طے پا سکتا
ہے۔

طیبہ کالج دہلی - میڈیکل کالج آگرہ - انجینئرنگ
کالج رڑکی و کلکتہ - مسلم یونیورسٹی علیگرہ - جامعہ
عثمانیہ دکن، ان تمام جامعات نے عرصہ دراز تک سائینسی
اور تکنیکی مضامین کی تعلیم ہماری مادری زبان اردو میں
دی تھی۔ اس وقت کراچی میں بھی اس کی زندہ مثال، 'اردو
کالج' موجود ہے۔ زندہ دلان پنجاب، باغبان اردو، سات ہزار
سے زائد اصلاحات علمیہ اور دفتری الفاظ وضع اور ترجمہ

کر چکے ہیں۔ دارالترجمہ عثمانیہ، دکن اور دیگر ماہران علوم کی توجہ سے مختلف علوم و فنون کی ہزاروں کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ اس سرمایہ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا ہماری یہ کوششیں، کاوش اور کاوش قابل اعتنا نہیں؟ ان نتائج اور نظائر کی موجودگی میں اگر اب بھی آپ یہ فرمائیں کہ اردو زبان اور اسکا رسم الخط ناقص اور غیر سہذب ہے اور ذریعہ تعلیم اور دفتری زبان نہیں بن سکتا تو سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ:

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

تعلیمی کمیشن کے روبرو ہماری سالانہ اوسط پیدائش و اسوات نیز پاکستان اور تمام ممالک کے تعلیمی اعداد و شمار موجود ہیں۔ ان کو بخوبی علم ہے کہ پرائمری سے ڈگری کالج اور یونیورسٹیوں تک ساڑھے سات کروڑ نفوس میں سے کتنے خوش نصیب ایسے ہیں جو علم کی دولت حاصل کر چکے اور کتنے زیر تعلیم ہیں اور کتنے نونہال اور نوجوان ایسے ہیں جو مدرسوں اور کالجوں میں داخل ہونے والے ہیں یا داخل ہونا چاہتے ہیں لیکن ان کے ماں باپ اور سرپرستوں کی اقتصادی پستی، درسگاہوں کا فقدان، آنکی اس آرزو کے مانع ہے۔ ہم اس وقت کتنی درسگاہوں کے مالک ہیں، یہ درسگاہیں کس حد تک ہماری تعلیمی ضروریات کی کفیل ہیں۔ ہمارے فاضل پروفیسروں اور اساتذہ کی موجودہ تعداد کیا ہے، ان میں سے کتنے ملکی ہیں اور کتنے غیر ملکی۔

اپنے کتنے ہی لائق جوہروں کو ٹھکرا کر جرمنی سے جرمن پروفیسروں کی کھیپ یہاں کیوں لائی جا رہی تھی -

اسلاف پرستی کا آج دنیا میں کوئی قائل نہیں، ہم بھی اس کے حامی نہیں لیکن مرحوم بزرگوں کی اعلیٰ روایات کو فراموش کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے، ان کے کارناموں کو تازہ اور زندہ رکھنا اور جن کاسوں کو وہ ناتمام چھوڑ گئے ہیں ان کی تکمیل ہمارا اخلاقی اور قومی فریضہ ہے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جب تک ہمارے اذہان غیر ملکی اثرات سے پاک نہیں ہوتے قومیت کا صحیح تصور ہمارے سامنے نہیں آسکتا اور اس وقت تک ہم علمی اور تخلیقی میدان میں ترقی کا کوئی خواب نہیں دیکھ سکتے -

ہمیں اپنے ماضی کے تلخ تجربات سے اپنے مستقبل کو روشن کرنا ہے، اس کا واحد ذریعہ تعلیم ہے، جسے سو فیصدی ہماری مادری زبان میں ہونا چاہئے، اس کا بجٹ بھی معقول ہو۔ جو سرمایہ انگریزی زبان کے فروغ اور رومن رسم الخط کی اشاعت میں لگایا جاسکتا ہے کیوں نہ اس کو اردو اور بنگلہ زبانوں کی تعلیم پر خرچ کیا جائے جب کہ حکومت اور عوام ان دونوں کو اپنی سرکاری اور قومی زبانیں تسلیم کر چکے ہیں اور دوسری پاکستانی زبانیں بھی اپنی اپنی جگہ پھول پھل رہی ہیں -

ثقا فتنی اقدار

وہ موتی علم کے یعنی کتابیں اپنے آباء کی
کہ دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارہ
(روح اقبال رح سے معذرت کے ساتھ)

جب کوئی قوم مسند جہاں بانی پر قدم رکھتی ہے تو
وہ سب سے پہلے زبان اور ادب کی طرف متوجہ ہوتی ہے
چنانچہ صدر ممالکت پاکستان کے وہ تازہ اعلانات جنہیں ہم
ابھی اپنی سابقہ سطور میں پیش کر چکے ہیں اس بات کا بین
ثبوت ہیں۔ تعلیمی کمیشن کا قیام بھی اسی مقصد کو واضح
کرتا ہے۔

فی الحقیقت زبان ہمارے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔
ان خیالات کو قلم تحریر کرتا ہے، یہ تحریر ہمارا رسم الخط
کہلاتی ہے، رسم الخط کے نقوش کو ہم اپنا ادب کہتے
ہیں۔ ادب حیات انسانی کی تفسیر ہے، اس تفسر میں زندگی
کے وہ اصول اور ضابطے سامنے آتے ہیں جن کا اطلاق انسانیت
پر ہوتا ہے جنہیں ہم بالفاظ دیگر اپنے مذہب سے تعبیر
کرتے ہیں۔ انسان اپنی حیات مستعار میں جو اچھے یا برے
اعمال پیش کرتا ہے وہ آئندہ نسلوں کیلئے تاریخ بن جاتے ہیں

جن سے ہشیار قومیں سبق اور تجربہ حاصل کرتی ہیں۔ قابل اخلاف اپنے لائق اسلاف کی اعلیٰ روایات پر عمل کر کے اپنے حال کو مستحکم اور مستقبل کو شاندار بناتے ہیں۔ جو قوم علم سے بیگانہ عمل سے عاری اور سیاسی اعتبار سے مفلوج اور محکوم ہوتی ہے اسکا ”پدرم سلطان بود“ کے راگ اپنے کے سوا زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آثار حیات چھوڑے بغیر صفحہ ہستی سے غائب ہو جاتی ہے، اس کے بعد اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہوتا۔ الغرض اس طرح قوموں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ قوموں کے عروج و زوال کا تاریخ سے، تاریخ کا مذہب یا انسانیت سے، انسانیت کا ادب سے، ادب کا رسم الخط سے اور رسم الخط کا زبان سے کتنا قریبی رشتہ ہے۔ یہ کڑیاں آپس میں اس طرح پیوستہ ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کڑی بھی نکل جائے تو سارا نظام ٹوٹ جاتا ہے مقصد یہ کہ ادب اجتماعی زندگی سے بے نیاز نہیں بلکہ اس کا ترجمان ہے اور جب ترجمان ہے تو اس کو ہماری زندگی پر اثر انداز ہونا چاہیے۔ اثر انداز ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر تنقید کرے، ہمارے اچھے اور برے اعمال کا نہ صرف جائزہ لے بلکہ اپنے جمالیاتی پرتو سے ہماری زندگی میں ایک تعمیری اور تاریخی انقلاب برپا کرے۔

ہم انقلاب کی بجائے لفظ اصلاح بھی لاسکتے تھے کیونکہ اصلاح ترقی کی ضامن ہے ترقی پسندی کا وجود انقلابی اور اصلاحی ہر دو ادب میں موجود ہے، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ انقلابی ادب سماج کے فرسودہ اور تباہ کن رسم و رواج کے خلاف علی الاعلان بغاوت کرتا ہے ان میں اساسی تبدیلیاں پیدا کر کے نظام زندگی کو ایک نئے سانچے اور صحت مند قالب میں ڈھالتا ہے۔ چونکہ اس کے اس باغیانہ طرز عمل سے حال کی بوسیدہ بنیادیں دھسنے بیٹھنے اور گرنے لگتی ہیں اس لئے بادی النظر میں اسے تخریبی سمجھا جاتا ہے حالانکہ جن خطوط پر وہ مستقبل کی شاندار عمارت اور اس کے گرد حصار کھینچنا چاہتا ہے وہ یقیناً تعمیری ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انقلابی ادیب سماج کے تمام طبقوں کی زندگی اور زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے ادب کا موضوع اور مبحث بناتا ہے۔

اس کے برعکس اصلاحی ادب سماج کی تمام کمزوریوں اور خرابیوں کو جو اس کے بنیادی ڈھانچے میں رسم و رواج کے بندھنوں سے جکڑی اور چمٹی ہوئی ہوتی ہیں تبدیل کئے بغیر ان نقائص کو ختم کرنا چاہتا ہے، وہ موجودہ سماج کے مذہبی، تمدنی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی عیوب کو بالواسطہ یا بلاواسطہ محسوس تو کرتا ہے، بعض اوقات بے چین ہو کر دل ہی دل میں کڑھتا بھی ہے لیکن خود اس کا مریض ہونے کے باعث ان پہاڑوں سے ڈکر لینے کی جرات یا ہمت نہیں کرتا۔

انقلابی اور اصلاحی ادب سے ہٹ کر ایک تیسرا ادب بھی ہے جسکی بنیاد خاص ادب پر ہے یعنی ”ادب برائے ادب“۔ اس ادب کے فنکار ادیب غم روزگار سے بے نیاز اور حقیقی سوز سے محروم ہوتے ہیں، وہ اپنے تخیل میں ہمیشہ رومانی قلعے اور فرضی جنتیں تعمیر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شورش تخیل کا نام حسن رکھا ہے، وہ اضطراب قلب کو عشق اور عشق کی ناکامیوں اور محرومیوں کو زندگی کا ماحصل اور خلاصہ کائنات جانتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ آرٹ فرد کی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے، آرٹسٹ حسن کا خلاق ہے۔ اس کی نگاہ میں اجتماعی زندگی کے مقاصد اور خارجی عناصر بے معنی اور لایعنی ہیں۔ وہ اپنی تصانیف میں معشیت، معاشرت اور سیاست کی آمیزش کو اپنی بدذوقی رخنہ اندازی اور غلامی تصور کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس کے قول و فعل پر کوئی اسے ٹوکنے والا نہ ہو۔ ایسے ادب کو زر کی حاکمیت، قومی انتشار، تمدنی انحطاط اور سیاسی بد حالی پروان چڑھاتی ہے۔ اس قسم کے ادب سے قوم کو ایک رسمی اور سطحی اتنا فائدہ ضرور پہنچتا ہے کہ بیگانہ ادب دماغ اور نوجوانانہ افراد وقت گزاری یا تعیش طبع کے لئے معروف اور غیر معروف شاعروں کا رنگین اور عاشقانہ کلام، ادیبوں کے جاسوسی اور رومانی ناول، افسانے، جن اور پری کی فرضی داستانیں اور غلط سلط مذہبی لٹریچر پڑھتے ہیں اس طرح

عوام میں سلکی زبان آہستہ آہستہ پھولتی پھلتی رہتی ہے۔
اس بھانے خواندگی کا معیار بھی بڑھتا رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب لغو اور بے معنی تو نہیں ہوتا
لیکن قطعاً غیر مقصدی ہوتا ہے ایسا ادب جسکا کوئی خاص
مقصد نہ ہو اور ادیب جو اس حقیقت سے نا آشنا ہو کہ اسکا
ادب قوم اور سماج کے لئے فائدہ بخش ہے یا ضرر رساں، ایک
ایسے راہی کی مانند ہے جس کی کوئی منزل نہ ہو۔ آن فنکاروں
کا کیا کہنا جو جمالیات کے مقلد ہونے کے ساتھ ساتھ ادب
کی افادیت اور مقصدیت کو واضح ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کے
مزاج اور روح کو بدل کر اسے عمل کا پیکر بنا دیتے ہیں
مدعا یہ کہ ادب کی تخلیق ایک مخصوص اور
واضح سماجی، اقتصادی اور سیاسی مقاصد کے ماتحت عمل
میں آنی چاہیئے جو قومی اور نسلی تعصب، علاقائی اور
طبقاتی کشمکش، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، جاگیرداری کے
نظام کہنہ، سرمایہ کو افراد کی ذاتی ملکیت، پیداوار
کی غلط تقسیم مزدور، کشی، عزت و ناموس کی پامالی، سیاسی
مسابقت، فاشزم، سوشلزم، کمیونزم اور تمام جدلیاتی لعنتوں
کا جانی دشمن اور قاطع ہو۔ جو مذہب کا امین، تہذیب و
تمدن کا محافظ، امن و عافیت کا علمبردار، مساوات کا حامی،
فارغ البالی کا پیش خیمہ، علوم و فنون کا نگراں، ذہنی
و روحانی صلاحیتوں کا خالق، ان تمام نظریات کا معنن،
ناشر اور ضامن ہو، زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی
کی تخلیق کرے۔

پروفیسر اختر انصاری علیگ، دور حاضر کے ایک مشہور ترقی پسند ادیب، نے اپنے مطبوعہ مقالے ”افادی ادب“ میں ادب کے اس موضوع پر نہایت ہی فاضلانہ انداز میں ایک سیر حاصل بحث کی ہے، یہ مضمون لکھتے وقت ہم نے بھی اس سے استفادہ کیا اور اس مقالے کی روح کو اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ اہل ذوق چاہیں تو اس کو پڑھ کر پورا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

ادب پر یہ مختصر سا تبصرہ ثابت کرتا ہے کہ قوسوں کی زندگی اور سلطنتوں کی بقا کا دار و مدار زبان اور ادب پر ہے۔ اسی لئے شاہان وقت اور حاکمان عصر سب سے پہلے اسکی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ شعر کتنا برمحل اور کتنی سچی ضرب المثل ہے :

قلم گوید کہ من شاہ جہانم

قلم کس را بدولت می رسانم

شمشیر آبدار اسقدر کارگر نہیں ہوتی جسقدر زبان خارا شگاف، زبان کے تمام جوہر رسم الخط میں پوشیدہ ہیں، اگر ہم پرایا رسم الخط اور غیروں کی زبان اختیار کریں تو ہمارے لئے یہ ایک ایسی تلوار ہوگی جو ہماری روحانی قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج کر دے گی۔ ہمارا عزم مضمحل، کردار پست اور عمل کا جوش و خروش ختم ہو جائے گا۔ ہم پھر دوسروں کے محکوم، غلام اور محتاج ہو جائیں گے۔

یوں تو ہمارے ادب کی ابتدا حضرت محمد بن قاسم کی تسخیر ہند (۱۱ء) سے ہوتی ہے، ارمغان حجاز

(عربی) وہی ہندوستان میں لائے تھے لیکن فی الاصل ہم اپنے ادب کے چوتھے دور سے گزر رہے ہیں۔ پہلا دور سلطان محمود غزنوی سے امیر تیمور پر ختم ہوتا ہے جب ہندوستان میں اردو کی داغ بیل پڑی، دوسرے دور کا اختتام (۱۸۵۷ء) کے ہنگامہ آزادی پر ہوا۔ یہ اردو زبان اور رسم الخط کی پرورش کا زمانہ تھا۔ تیسرا پر آشوب دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا وہ زمانہ ہے جس میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہمارے سابق ہم وطن اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے خلاف درپے آزار رہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے اس عرصہ چپقلش میں برصغیر ہند و پاک میں انگریزی حکومت نے ترجمہ و تالیف کا ایک بھی ادارہ قائم نہیں کیا اور نہ فنکاروں کی کبھی پرسش اور ہمت افزائی ہوئی۔ جو کچھ ہوا وہ قوم کی ذاتی اور نجی کوششوں سے ہوا دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام بھی ایک محکوم ریاست ہونے کے باعث نیم سرکاری ادارے سے زائد نہ تھا مگر بہر نوع ایک نعمت غیر مترقبہ تھا جس سے ہم ایک بڑی حد تک مستفید ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا ادب اور ہمارے فنکار دونوں سرمایہ دارانہ نظام اور ہندی تعصب کا شکار اور مجسم فریاد ہو کر رہ گئے اور اب ہماری آزادی کے یہ بارہ طویل برس بھی اسی گذارش و التجا، آرزو اور ارمان میں گزر گئے۔ دو چار آنسو پونچھ کر طفل تسلیوں سے بہلایا گیا تو کیا ہوتا ہے نہ کوئی دارالترجمہ ہے اور نہ کوئی اردو یونیورسٹی۔

اسلامی تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے تو دماغ گنگ اور عقل حیران ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں عربوں کے پاس کیا تھا، صرف زہیر و لبید کی عشقیہ شاعری۔ لیکن جب انہوں نے ادب کی طرف توجہ کی تو صرف ڈیڑھ سو برس کی قلیل مدت میں وہ علوم و فنون کے مالک بن گئے۔ آنحضرت صلعم کی وفات ۶۳۲ء میں ہوئی۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین کا تیس سالہ مختصر دور (۶۳۲ء - ۶۶۲ء) اسلامی سیاست کا دور طفولیت تھا مگر ادب کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ ادب و انشاء کا آغاز دراصل عہد بنو امیہ (۶۶۱ء - ۷۵۰ء) سے ہوتا ہے جسکا فروغ عہد بنو عباسیہ (۷۵۱ء - ۷۵۰ء) میں ہوا۔ اس عہد آخر میں زوال بغداد اور اسپین کا اسلامی دور بھی شامل ہے۔ ۸۵۰ سال کی مدت میں اسلام نے جس سر زمین پر قدم رکھا وہیں علوم و فنون کے چشمے پھوٹ نکلے سیکڑوں علماء و فضلاء پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی ہزارہا تصانیف پیش کر کے مختلف علوم و فنون کے سمندر بہائے اور تمام دنیا کو سیراب کیا۔ غلام جیلانی برق اپنے ایک مضمون ”ادبائے اردو کی خدمت میں“ مطبوعہ ’نقوش‘ لاہور میں لکھتے ہیں :

”عہد ماسوں میں بغداد کا یہ عالم تھا کہ عام آبادی تھوڑی تھی اور علماء زیادہ، تالیف و ترجمہ کے بے شمار ادارے قائم تھے، جہاں یونانی، شامی، آرامی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت سے عربی میں تراجم ہوتے تھے۔ صرف بغداد میں ۷۲ لائبریریاں

تھیں جن میں کتب کی مجموعی تعداد تین کروڑ
 سے کم نہ تھی، عبدالرحمن نے اسپین میں ایک
 کتب خانہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں بقول ڈریپر
 ۱۵ لاکھ کتابیں تھیں۔ ماموں کی والدہ زبیدہ کے
 ذاتی کتب خانہ میں ۶ لاکھ سے بھی زائد کتب
 تھیں۔ . . . ایک بزرگ ایسے بھی ہو گزرے ہیں
 جنہوں نے قرآن حکیم کی تفسیر بارہ سو جلدوں میں
 لکھی تھی،، -

الغرض ماضی بعید کی ان عظیم اور دانشمند شخصیتوں
 نے اپنے آپ کو علم کیلئے وقف کر دیا تھا۔ یہ انہیں
 عالی حوصلہ اور بلند ہمت بزرگوں کا فیض تھا جنہوں نے
 خیابان عربی کو گونا گوں گلہائے ادب سے معمور کیا،
 دنیائے اسلام کی شان و شوکت کا سہرا دراصل انہیں کے
 سر ہے۔ انہیں کے موئے قلم نے مسلمانوں کے ادب کو
 چار چاند لگائے۔ اسی عربی سے فارسی نے فروغ پایا۔
 اردو کو بھی فصاحت اور شیرینی انہیں دونوں زبانوں نے
 بخشی۔ ہمارا رسم الخط بھی ان ہی کا تحفہ ہے جسے
 ہم نے کئی سو برس کی محنت و مشقت کے بعد مرصع اور
 مہذب بنایا ہے، آج ہم اس قابل ہیں کہ دوسری تعلیم یافتہ
 قوموں کے رو برو فخر کے ساتھ اپنی زبان اور رسم الخط کو
 پیش کر سکتے ہیں چہ جائیکہ ہم اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔
 وقت کی بڑھتی ہوئی نئی ضروریات کے ماتحت البتہ چند فنی
 اور طباعتی دشواریاں ہماری راہ میں ضرور حائل ہیں لیکن

یہ سب سطحی اور عارضی مشکلات ہیں، ان پر بھی جلد یا بدیر قابو پایا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم صحیح معنوں میں اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور حکومت کا رویہ مربیانہ اور سرپرستانہ ہو۔ رسم الخط کی تبدیلی کی یہ تحریک سراسر غیر اصلاحی اور قطعاً بے جان ہے۔ ہم اردو کو اس طرح تہ تیغ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ مولانا روسی، حافظ، سعدی، فردوسی، خیام، خسرو، سرسید، میر، غالب، شبلی، حالی، آزاد اور اقبال کو جو ہمارے ادب کے سہرو و ماہ ہیں ان کے کارناموں کو نہیں بھول سکتے۔

ذرا غور تو کیجئے ہماری صحافت کا کیا حشر ہوگا۔ وہ صحافت جو ہر سماج کا جزو اعظم ہوتی ہے۔ صحافیوں کو سخت سے سخت اور ناسازگار حالات میں بھی عوام کے حقوق و مفادات اور ملک کے دفاع و آزادی کیلئے ہمیشہ پیش پیش رہنا پڑتا ہے۔ قلم صحافت کی آہنی جنبشیں قوم کے ارتقائی رجحانات کی تائید کے ساتھ ساتھ سماج کے فرسودہ عناصر اور تباہ کن رسم و رواج کے خلاف ہمہ وقت قلمی جہاد کرتی ہیں۔ ان کی یہ سنجیدہ اور مخلصانہ عملی سرگرمیاں ملک و قوم کو جمہوری نظام کا ایک حسین تصور ایک خوش نما آئیڈیل پیش کرتی ہیں۔ پاکستان میں اس تصور، اس آئیڈیل کو نیزہ عربی سے تراشا ہوا اردو قلم، میر و مرزا کی زبان اور اقبال کی 'بانگ' اور 'ضرب' ہی پیش کر سکتی ہے۔

ہمارے ملک کے ۹۹ فیصدی رسائل اور اخبارات اقتصادی اعتبار سے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا

ہیں۔ ان کی حیات محض تجارتی اشتہارات پر موقوف ہے۔ اگر رسم الخط کی تبدیلی عمل میں آئی تو یہ سب زندہ درگور ہو جائیں گے۔ مالکان اخبار میں ایسا کون سا قارون اور حاتم صفت مالک اخبار ہے جو اپنے اخبار یا رسالے کو روسن ٹائپ میں چھپوا چھپوا کر اپنے دفتر میں اس کی ٹنوں ردی جمع کرتا رہے گا اور پھر اس اخبار کو کورٹیوں کے مول فروخت کرے گا۔ اس طرح پریس کی آواز اور رائے عامہ کہاں تک باقی رہے گی؟

آج جب از منہ قدیم کا ایک ایک آثار، ایک ایک پتھر اور ایک ایک ذرہ کھود کھود کر ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جا رہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ، حرف اور نقطے کو پڑھ کر عہد قدیم کی تاریخ مرتب کی جا رہی ہے۔ ان نوادرات پر لا کھوں روپیہ صرف کر کے انہیں عجائب خانوں کی زینت بنایا جا رہا ہے، ان کی ہر ممکن حفاظت کی جا رہی ہے، لیکن اردو زبان اور اردو رسم الخط جیسی قدیم اور عزیز یادگار کو فنا اور دریا برد کرنے کی درد ناک تدابیر سوچی جا رہی ہیں۔

کیا کیا کہوں، کہتے ہوئے ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے، وقت کسی کی ملکیت نہیں کار و بار زندگی کے لئے تو قدرت کا نظام شمس و قمر ہی کافی ہے جسے ہم دن اور رات سے تعبیر کرتے ہیں، ان ہی کی بنیاد پر ماہ و سال اور صدیوں کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن شمس و قمر کے طلوع و غروب کے ماتحت اقوام عالم نے ”گرینچ ٹائم“ کو اپنا

رہبر وقت بنا کر اپنے اپنے ملک کا وقت مقرر کیا، جب ہم غلام تھے ہمارا وقت حاکم عہد کے وقت کا محکوم تھا۔ ہماری جد و جہد آزادی سے جوں ہی آزاد پاکستان وجود میں آیا تو شہید ملت نواب لیاقت علی خاں نے فرمایا کہ ہمارا بھی ایک اسٹینڈرڈ ٹائم ہونا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے وقت کی سوئیاں تبدیل کر دی گئیں، مغربی اور مشرقی پاکستان کا ٹائم مقرر ہو گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا، کام تو اس کے بغیر بھی چل رہا تھا اور چل سکتا تھا لیکن وہ دانائے وقت جانتا تھا کہ وقت کا غلام ہونے سے وقت کا آقا ہونا ہزار درجے بہتر و افضل ہے، واضح رہے کہ یہ قطب نما اور وقت نما (گھڑی) بھی مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ ہارون الرشید نے فرانس کو ایک گھڑی تحفہ میں بھیج کر یورپ کو ”گرینج ٹائم“ کا مالک بنایا۔ ارض و سما کے تمام علوم ہماری ہی تحقیق اور ہمارے ہی بخشے ہوئے ہیں۔ یہ وقت کی کرشمہ سازی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم مغرب زدہ ہو کر جہاں سے چلے تھے پھر وہیں لوٹنے کی فکر کر رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ رجعت پسند کون ہے؟

ان تاریخی شواہد کی موجودگی میں ہمارا اردو زبان اور اردو رسم الخط کا مطالبہ جائز ہے یا ناجائز، نیا ہے یا پرانا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم ماضی قریب میں آزاد ہوئے ہیں ابھی ہمارا دستور مکمل اور نافذ نہیں ہوا ہے، اس لحاظ سے زبان اور رسم الخط کا مسئلہ بھی ہنوز تازہ اور نیا ہے، اتمام حجت کی خاطر اگر ہم اپنی اس قدیم تحریک کو نئی

تحریریک مان لیں اور رسم الخط کو بھی اس میں شامل سمجھ لیں جو اس وقت تعلیمی کمیشن کے رو برو ہے تو کیا ارباب نظر کا یہ انتہائی فریب نظر اور کوتاہ بینی نہ ہوگی کہ وہ ہماری ہدھا برس کی کوششوں اور کوششوں کو یکسر نظر انداز کر دیں۔

اگر ہماری ان سابقہ مساعی کو انگریزی اور امریکی مصلحتوں کی خاطر نظر انداز کیا گیا تو یقین کیجئے کہ ہماری حکومت کا یہ سرکاری اقدام بھی محض وقتی اور ہنگامی ہو کر رہ جائے گا کیونکہ زبان اور رسم الخط عوام کی ملکیت ہے، حکومت تو صرف اس کی محافظ اور امین ہے، یہی وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ اس زبان اور رسم الخط کی خاطر ہم نے بھارت سے اس لئے تو ٹکر نہیں لی تھی کہ آزاد اور خود مختار ہونے کے بعد ہم اپنی اس دولت سے انگریزوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں گے۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس بھی اسی نظریہ کا شکار ہوا تھا۔ روس کی نئی تحریریک انتہا پسند اشتراکیت نے اپنے ماضی کی تمام روایات کو یکسر اور تمام تر حرف غلط کی طرح فراموش کر دینا چاہا تھا لیکن انجام کار اس کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی اور روش کو بدلنا پڑا۔

ہمارے ادب میں جو ترقی پسند رجحانات پیدا ہو چکے ہیں اور جو نیا انقلابی اور تعمیری دور شروع ہونے والا ہے اس کی باگ ڈور اور تمام تر ذمہ داری ملک کے موجودہ ادیبوں کے ہاتھوں میں ہے، انہیں وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑے گا،

اپنی ذہنیتوں میں حسب ضرورت لچک اور سختی دونوں پیدا کرنی ہوں گی۔ رجعت پسندی کو بالائے طاق رکھ کر شعر گوئی، ڈرامہ، ناول نگاری اور افسانہ نویسی کو محدود اور مختصر کرنا پڑے گا، ادب کے دھاروں کا رخ علوم و فنون کی سمت پھیرنا ہوگا۔ ترجمہ، تالیف اور تصنیف کے ذریعے ان مختلف علوم و فنون کو جو اس وقت ہمارے مدرسوں، کالجوں اور فنی درسگاہوں میں پڑھائے جاتے ہیں یا زیر غور ہیں اور اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے ہیں داخل اور شامل کرنا ہوگا تاکہ آنے والی نسلیں اور مستقبل کا سورخ ہمارا نام بھی تعظیم کے ساتھ لے اور ہمیں محبت سے یاد کرے۔

صوبجاتی اور بین الاقوامی اتحاد

تیرے علم و محبت کی تمہیں ہے انتہا کوئی
تمہیں ہے تجھ سے بڑھکر ساز فطرت میں نوا کوئی
اقبال رح

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے یہ
حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ پاکستان کے بیشتر حصوں کی
علاقائی زبانوں — پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور فارسی
— کا رسم الخط اردو ہے یا اردو سے بالکل ملتا جلتا ہے،
اس کے علاوہ چونکہ اردو زبان میں ان تمام زبانوں کے الفاظ
بھی شامل اور مستعمل ہیں اس لئے ایک معمولی فہم و قابلیت
کا آدمی بھی ان زبانوں کو اردو رسم الخط میں با آسانی پڑھ
سکتا ہے۔ ان زبانوں کے برعکس بنگلہ کا رسم الخط دیوناگری
ہے اور اس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت ہیں، لہذا
بیرون بنگال یہ نا قابل فہم ہے، البتہ قدیم ٹھیٹ بنگلہ کے
مقابلے میں اب جو جدید آسان بنگلہ اردو رسم الخط کے روپ
میں ہمارے سامنے آ رہی ہے وہ نسبتاً زیادہ آسان اور سمجھ
میں آئیوالی ہے۔ اگر اردو بنگلہ اتحاد کی یہ مبارک تحریک
اسی طرح پروان چڑھتی رہی تو اس بات کے روشن امکانات
ہیں کہ جلد یا بدیر ایک وقت ایسا آئے گا جب اردو

رسم الخط کے سہارے مغربی پاکستان کے عوام عربی، فارسی اور انگریزی کی طرح بنگلہ کو بھی اپنی ایک علمی زبان بنالیں گے اور کیا عجب کہ اس اتحاد کی روشنی میں بنگلہ کا موجودہ دیوناگری رسم الخط دھندلا ہوتے ہوتے بالکل ہی غائب ہو جائے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگلہ گو با اعتبار بولی کثرت آبادی کے باعث پاکستان کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے مگر بلحاظ رسم الخط مغربی پاکستان میں اس کو وہ حیثیت حاصل نہیں جو آسے مشرقی پاکستان میں حاصل ہے، اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان کی علاقائی زبانیں بالخصوص اردو مشرقی پاکستان میں زیادہ رائج ہے۔ رہا انگریزی کا معاملہ تو اس کی نوشت و خواند سے واقف پورے پاکستان میں صرف ۱۴ لاکھ نفوس ہیں۔ انگریزی کی یہ تعداد اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی اکثریت اس سے متنفر ہے۔

ما حاصل یہ کہ پاکستان جو مختلف زبانوں کا گہوارہ ہے اگر اس کی تمام قومی زبانیں سب سے زیادہ محبوب اردو رسم الخط میں تحریر کی جائیں اور ان کی تعلیم دی جائے تو اس رسم الخط کی یکسانیت کی وجہ سے تمام زبانیں اپنی اپنی جگہ پہلے سے زیادہ پھولیں پھلیں گی اور اس طرح اردو اور بنگلہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے لئے قابل قبول سرکاری زبانیں ہو جائیں گی۔ اس وقت دونوں زبانوں میں رسم الخط کی وجہ سے غیریت ہے، اس وقت اتحاد ہوگا جیسا کہ دوسری زبانوں کا حال ہے کہ ان سے کسی کو کوئی چشمک یا

رقابت نہیں ہے۔ رومن رسم الخط اختیار کرنے کا تو صاف اور صریح نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان میں مغرب سے مشرق تک پورے ۸ کروڑ عوام کو تمام زبانوں کی تعلیم، رومن رسم الخط میں دینے کی زبردست کھکھیڑ اٹھانی پڑے گی اور تمام زبانوں کے ثقافتی سرمایہ کو رومن رسم الخط میں تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس عمل سے قوم کی دولت اور وقت کا جس قدر نقصان عظیم ہوگا وہ ظاہر ہے۔

ہر زبان میں خواہ وہ کتنی ہی ناخواندہ اور پس ماندہ طبقے کی ہو کچھ نہ کچھ ادب ضرور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری تمام علاقائی زبانیں اپنی کچھ روایات رکھتی ہیں۔ ان کی زبان کے ادب کا تمام تر سرمایہ ان کے رسم الخط میں ہے جسے وہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے، یہی صورت بنگلہ کی ہے، مغربی پاکستان کی بہ نسبت مشرقی پاکستان زیادہ پس ماندہ ہے لیکن اس پس ماندگی کے باوجود وہ اردو (جسے وہ سمجھ سکتا ہے، صرف لکھ نہیں سکتا) کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان ماننے کے لئے تیار نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ رومن رسم الخط کو کس طرح پسند کر لے گا۔

استصواب رائے کے سلسلہ میں جو مراسلات 'جنگ' میں شائع ہوئے تھے ان میں ایک صاحب نے ایک بنگالی بھائی کا یہ قول نقل کیا تھا: "کہ ہم اردو کے بہر صورت مخالف ہیں اور مخالف رہیں گے خواہ وہ اپنے موجودہ رسم الخط میں رہے یا رومن لباس میں سامنے آئے۔"

اسی طرح ہمارے ایک دوست کے بقول مشرقی پاکستان میں بنگلہ بولنے اور لکھنے والے، دیوناگری رسم الخط کے مقابلے میں عربی نسخ اور اردو نستعلیق کو ایک مقدس یا بھاری پتھر سمجھ کر محض چوم کر چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ مشرقی پاکستان کی ”انجمن حروف القرآن“ نے لاکھوں کتابیں عربی رسم الخط میں چھاپ کر اور لاکھوں بنگالی طلبا کو سکھا اور پڑھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان بچوں کو عربی رسم الخط سکھا کر تمام زبانوں کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ بہر نوع جس طرح اردو کے لئے رومن رسم الخط قابل قبول نہیں ہے اسی طرح ہماری تمام علاقائی زبانوں اور بالخصوص بنگلہ کے لئے بھی قطعاً غیر موزوں ہے پھر بھی اسکا آخری فیصلہ بنگلہ کے ماہران زبان ہی کر سکتے ہیں، البتہ کمیشن کا اپنی جگہ یہ سمجھانا ایک خیال خام ہے کہ رومن رسم الخط اردو اور بنگلہ کی خلیج کو پاٹ سکتا ہے جب کہ دونوں فریق اردو اور بنگلہ کو بادل خواستہ یا ناخواستہ پاکستان کی سرکاری زبانیں پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں۔

جہاں تک ہمارے بین الاقوامی اتحاد اور امن کا تعلق ہے ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اول تو تمام ممالک اسلامیہ، مذہبی وحدت اور اسلامی رشتہ اخوت کی بناء پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں دوم ہمیں جغرافیائی اتصال کی بدولت قربت مکانی بھی حاصل ہے۔ سوم تمام بلاد اسلامیہ (بجز ان حکومتوں کے جو فرانس یا برطانیہ کے

ابھی تک زیر اثر ہیں) کی مذہبی، علمی اور قومی زبان عربی، فارسی اور اردو ہے اور رسم الخط قرآنی ہے جو اردو سے بے انتہا مشابہ ہے اس ربط اور مناسبت کے باعث ہم ایک دوسرے کی زبان خاصی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے ذہنی قربت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی قدیم آبائی زبان اور رسم الخط کو ترک کر دیا تو جس طرح ترکی اسلامی ممالک سے کٹ گیا ہم بھی ان کے اجنبی دوست بن جائیں گے۔ اردو زبان سامی زبانوں کے رسم الخط کو اپنائے ہوئے ہے۔ رومن رسم الخط اختیار کرنے میں ہمیں آن ہی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا جن سے گھبرا کر ایران اور مصر وغیرہ نے رومن رسم الخط کا خیال ترک کر دیا۔ انہوں نے اپنے رسوم الخط میں حک و اضافہ کر کے اپنی ضروریات کو اس حد تک پورا کیا کہ آج ان کا اپنا ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر دونوں موجود ہیں، ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ان ممالک کے مقابلے میں ہم جغرافیائی اعتبار سے یورپ سے بہت دور ہیں، بدیں وجہ ہمیں رسم الخط کی تبدیلی سے فائدہ کی بجائے نقصان بہت زیادہ ہوگا۔

بلاشبہ ہمیں وقتی سیاست نے اقوام یورپ کا حلیف بنا دیا ہے، اگر حلیف بن کر امن عالم برقرار رہ سکتا ہے تو ہم اس اتحاد کو ہمیشہ لبیک کہیں گے لیکن بظاہر یہ اتحاد مصنوعی، ہنگامی اور وقتی نظر آتا ہے اور کسی وقت بھی ختم ہو سکتا ہے، جیسے عراق اپنے حالات اور مصلحتوں کے پیش نظر معاہدہ بغداد سے علیحدہ ہو گیا۔ اس وقت لڑائی

چین اور تبت کے درمیان ہے لیکن چین بھارت سے کشیدہ خاطر ہو رہا ہے۔

چین اور جاپان نے جن کی زبانیں بہت ہی مشکل اور رسم الخط نہایت پیچیدہ ہے، مغربیت کو تو اپنا لیا لیکن آج تک اپنی زبان نہیں بدلی۔ یہی حال روس اور فرانس کا ہے بلکہ فرانس پر تو یہ الزام ہے کہ یورپ کے اکثر ممالک اس کی زبان بولتے ہیں لیکن فرانس اپنی فرانسیسی زبان کے سوا کسی دوسری زبان کو منہ نہیں لگاتا۔ بھارت اس باب میں یورپ کی تقلید کیوں نہیں کرتا، کیا اس کام کے لئے صرف ہم پاکستانی ہی رہ گئے ہیں کہ اپنی زبان کو یورپ کی قربان گاہ پر بھیٹ چڑھا دیں۔

مخالف پرو پیگنڈے کے باوجود اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ سال گذشتہ جب پاپائے روم نے اپنی معتقد دنیا سے خطاب کرنے کے لئے دنیا کی اول درجے کی زبانوں کا انتخاب کیا تو ان زبانوں میں ایک ”اردو“ بھی تھی۔ اور تو اور روس کی خبر رساں ایجنسی ”تاس“ کی حالیہ اطلاع کے مطابق گذشتہ مارچ ۱۹۵۹ء ہی میں افریقی ایشائی سوسائٹی کے زیر اہتمام بیگانہ مذہب روس کے قلب ماسکو میں ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی اور اس میں مرزا غالب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اسی طرح ترکی اور ایران وغیرہ میں یوم اقبال پر روح اقبال رح کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یورپ میں مولانا رومی،

سعدی اور خیام وغیرہ کے کلام نہایت آب و تاب کے ساتھ
مصنوع شائع کئے جاتے ہیں، ان کے تراجم بھی مختلف زبانوں
میں ہو چکے ہیں۔

اس سے قبل خطاطی کے باب میں متعدد ایسے ممالک
کو پیش کیا جا چکا ہے جو اپنی علیحدہ قومی زبان اور
رسم الخط رکھتے ہیں لیکن السنہ عربی و اردو اور ان کے
رسوم الخط سے بے نیاز اور مستغنی نہیں۔ ان کی جامعات میں
ان دونوں زبانوں کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے وہاں عربی
اور اردو لکھنے اور پڑھنے والے دونوں موجود ہیں۔ کیا یہ
اردو کا اعجاز، عالم گیر مقبولیت اور اتحاد کا ثبوت نہیں؟

دفتری نظم و نسق اور کاروباری تقاضے

رعنائی میں تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جواء ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
(اقبال رح)

ملک کے نظم و نسق اور کاروبار سلطنت کو چلانے
کیلئے مختلف شعبوں اور محکموں کے ماتحت سیکڑوں دفاتر
فیکٹریاں اور کارخانے قائم ہوتے ہیں سرکاری بھی اور نجی بھی
جن میں ایک مخصوص نظام کے مطابق شب و روز لاکھوں
نفوس کام کرتے ہیں دفاتر کی یہ تنظیم ناگزیر ہے، اگر وقت،
کام، محنت اور دولت کی تقسیم صحیح نہ ہو تو دنیا کا سارا
کاروبار درہم برہم ہو جائے۔ اس جسمانی اور دماغی محنت
و مشقت میں لکھنے پڑھنے کا عمل بھی شامل ہوتا ہے آمدنی
اور خرچ کے حساب و کتاب کے علاوہ ہر روز اندرون و بیرون
ملک مختلف حکومتوں اور لاکھوں اشخاص کے درمیان خط و
کتابت ہوتی ہے۔ اس سرکاری اور نجی مراسلت میں جو زبان اور
رسم الخط استعمال ہوتا ہے دراصل وہی اس ملک کی زبان
اور رسم الخط کہلاتا ہے۔ اگر کسی ملک کی زبان اور

رسم الخط اتنا عام فہم اور مکلف ہو کہ اسے اپنے ملک کی اکثریت کے علاوہ دوسرے ممالک کے لوگ بھی جانتے ہوں تو ایک دوسرے کے مافی الضمیر سے آگاہ ہونے کے علاوہ کاروبار میں بڑی آسانی مسہولت اور بچت ہوتی ہے ورنہ عدم واقفیت کی بناء پر ترجمہ کی مشکلات پیش آتی ہیں اس کی وجہ سے کارکردگی، وقت اور دولت کا خرچ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ ایک عقدہ لاینحل ہے یہ واقعہ ہے کہ ممالک عالم اور اقوام عالم کی زبان اور رسم الخط نہ کبھی ایک ہوا ہے اور نہ کبھی ایک ہو سکتا ہے، ہم دیکھتے آئے ہیں اور آج بھی یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہی ملک کے عوام مختلف زبانیں اور مختلف رسوم الخط استعمال کرتے ہیں پھر بھی کاروبار زندگی اندرون و بیرون ملک بہر نوع برابر جاری رہتا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان بحیثیت مجموعی ایک زرعی ملک تھا، باعتبار صنعت و حرفت دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں اس کا معیار پست تھا۔ جب ملک تقسیم ہوا تو ریڈکلف ایوارڈ کی عنایت سے صنعتی علاقے ہندوستان کو مل گئے اور پاکستان کورا ایک زرعی خطہ رہ گیا، صرف چار فیصدی صنعتی کارخانے پاکستان کے حصے میں آئے، بلاشبہ یہ پاکستان کی خوش نصیبی تھی کہ اس کی زرعی پیداوار میں میں خوردنی اور تجارتی فصلیں ملک کی ضروریات سے کہیں زائد تھیں۔

ذرائع نقل و حمل میں بھی تقسیم ہندوستان نے پاکستان کو ٹوٹے میں رکھا۔ تقسیم سے قبل دوسری جنگ عظیم کی بدولت اور تقسیم کے فوراً بعد مہاجرین کی بے پناہ آمد و رفت کے باعث پاکستانی ریلوں اور سڑکوں پر بے تحاشا بار پڑا جس سے ان کی حالت خراب اور تباہ ہو گئی پاکستان کے حصے میں بندرگاہیں بھی صرف دو آئیں ایک کراچی اور دوسری چائنگام۔

جہاں تک ہماری تجارت کا تعلق ہے وہ بھی تقسیم ہندوستان سے قبل زیادہ تر غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی۔ تقسیم کے بعد یہ تمام تاجر اور سرمایہ دار اپنی دولت سمیٹ کر ہندوستان چلے گئے اس طرح پاکستان کی تجارت، بنکاری وغیرہ پورے معاشی نظام کو زبردست صدمہ پہنچا۔ یہ تھا وہ پس منظر اور ناخوشگوار ماحول جس میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس انقلاب نے جس زبوں حالی سے ہمیں دو چار کیا تھا اس کو دیکھ کر پاکستان کے مخالفین ہنس ہنس کر ہم پر طنز کیا کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ پاکستان ایک شاعر کا خواب اور شیخ چلی کا ایک منصوبہ ہے لیکن اسلام جوہر کر بلا کے بعد زندہ ہوتا ہے اس نے اس مرتبہ بھی حیات نو پائی اور اپنے زندہ ہونے اور زندہ رہنے کا ثبوت پیش کر کے رقیبوں کو قائل اور حیرت زدہ کر دیا۔ ہم نے اپنے رقیبوں کو اپنی زندگی کا ثبوت تو پیش کر دیا لیکن اس جدوجہد زندگی میں کچھ تلخ حقائق بھی شامل ہیں قدرت نے ہمیں جو بے شمار خزانے اور بے پناہ قوتیں بخشی تھیں اول اول تو ہم نے ان

سے فائدہ اٹھایا لیکن تھوڑی ہی مدت بعد ہمارے حاکمان وقت اور ان کی دیکھا دیکھی دولت کے غلام، حریص عوام، دولت و اقتدار کی پرستش کرنے لگے، ہماری مفلسی اور بد حالی پھر عود کر آئی۔ نوبت باایں جا رسید کہ ہم خوراک کے مسئلہ میں بھی غیروں کے محتاج ہو گئے۔ ہمارا دستور سلطنت کھٹائی میں پڑا رہا، عوام چیختے چلاتے اور روتے پیٹتے رہے۔ آخر کاسل دس سال بعد مارچ ۱۹۵۷ء میں اسلامی دستور و قانون کے نام پر ایک نامکمل اور ناقص دستور غیر زبان اور غیر تحریر میں پاس ہوا جس میں سرکاری زبان کے متعلق حکومت کا یہ فیصلہ سامنے آیا:—

(۱) ”پاکستان کی سرکاری زبانیں ’اردو، اور ’بنگالی، ہوں گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ یوم دستور سے بیس سال تک انگریزی زبان کا استعمال ان تمام سرکاری اغراض کے لئے جاری رہے گا جن کے لئے وہ یوم دستور سے عین قبل تک پاکستان میں استعمال کی جاتی تھیں۔ لیکن مذکورہ بیس سال کی مدت ختم ہو جانے کے بعد پارلیمنٹ مجاز ہوگی کہ بذریعہ قانون ان اغراض کے لئے جن کی صراحت قانون مذکور میں کر دی گئی ہے انگریزی استعمال سے متعلق احکام وضع کرے۔“

(۲) یوم دستور سے بیس سال گذر جانے کے بعد صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا جو انگریزی کی جگہ دوسری زبان اختیار کرنے کی بابت سفارشات پیش کرے گا۔

(۳) دفعہ ہذا میں مذکور، کوئی حکم، کسی صوبائی حکومت کو، اس امر سے باز نہ رکھ سکے گا کہ وہ مذکورہ بیس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے، انگریزی زبان کی جگہ کوئی دوسری زبان صوبے میں استعمال کے لئے اختیار کرے۔

دستور کے الفاظ میں رسم الخط کا کوئی ذکر نہیں ہے، ظاہر ہے کہ بیس سال کی مدت ختم ہونے سے قبل بجز مرکزی حکومت کے ہر صوبائی حکومت اس امر کی کاپیتاً مجاز ہے کہ کسی بھی زبان کو اپنے صوبے کی سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کرے اور اس زبان کی ادائیگی کے لئے اسے جو رسم الخط پسند ہو وہ استعمال کرے۔ لیکن نارشل لاء کے نفاذ نے چونکہ سابقہ دستور کو سردست کالعدم کر دیا ہے لہذا اس وقت ان اختیارات کو زیر بحث لانا خارج از بحث ہے۔ موجودہ گورنمنٹ زبان کے مسئلہ پر رسم الخط کی روشنی میں غور کرنا چاہتی ہے۔ اگر فی الحقیقت غور و فکر مطلوب ہے جو سابقہ حکومتوں کا فرض تھا، تو یقیناً یہ ہماری دوراندیشی اور فکر صحیح کی دلیل ہے اور اگر یہ سوچ بچار محض رسمی اور ظاہری ہے اور درپردہ یہ طے ہو چکا ہے کہ انگریزی زبان کا جو جواء بیس سال کے لئے ہماری گردنوں پر رکھا جانا تجویز ہوا تھا وہی ہمیشہ کے لئے ہم پر مسلط رہے گا تو بلاشبہ یہ فیصلہ غیر دانشمندانہ اور ناپائیدار ہوگا۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور

کریں اور کسی نتیجہ پر پہنچنے سے قبل دوسرے ممالک کے فیصلوں پر بھی ایک نگاہ ڈالیں بالخصوص ان ملکوں کے جو ماضی قریب میں ہماری طرح آزاد ہوئے ہیں، مثلاً انڈونیشیا اور ملایا۔

’انڈونیشیا، ۱۹۴۷ء میں ہمارے ساتھ ہی ساتھ آزاد اور خود مختار ہوا ہے، اسی طرح ’ملایا‘ کو صرف دو سال قبل ۱۹۵۷ء میں آزادی ملی ہے۔ یہ دونوں ممالک مسلمان ہیں۔ اول انڈونیشیا کے دستور پر نظر ڈالئے۔ انڈونیشیا کے سفارت خانہ، کراچی نے حال ہی میں جو ’’تاریخ تمدن انڈونیشیا‘‘ شائع کی ہے اس پر رسالہ ’’اردو‘‘ کے فاضل مدیر نے اپنے شمارہ بابت جولائی - اکتوبر، ۵۸ء میں ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرہ میں انڈونیشیا کی سرکاری زبان کا جو مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی رو سے ہمارے ملک میں جو زبانیں قابل لحاظ اور شمار ہیں ان کی تعداد صرف نو ہے۔ اس کے برعکس انڈونیشیا میں اس وقت (۲۵۰) زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں، جاوائی، سنڈائی، سدورائی، مننگ کباؤئی، آچپائی، بوگینی، بالینی، ملائی، بنجوسامینی اور ٹوروجائی زیادہ مستعمل ہیں۔ حسن اتفاق سے ان کی تعداد ہمارے ملک کی زبانوں سے صرف ایک زائد ہے اسی طرح انڈونیشیا کی آبادی بھی کم و بیش پاکستان کے برابر ہے۔ انڈونیشیا کی ان تمام زبانوں کا ساخت و ساخت لسانی حیثیت سے ’ملائی‘ ہے جو

سماترا اور جزیرہ 'نما' ملایا' میں ۱۵۲۰ء سے عربی رسم الخط میں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ 'جاوائی' زبان اگرچہ سوا سات کروڑ نفوس میں سے چار یا پانچ کروڑ عوام کی زبان ہے مگر اپنے قدیم سنسکرت اور کادی رسم الخط کے باعث بجز جاوا کے دیگر جزائر میں نہ تو عموسیت کے ساتھ بولی جاتی ہے اور نہ سمجھی جاتی ہے۔

یہی صورت بنگلہ اور اردو کی ہے۔ بنگلہ کا رسم خط دیوناگری ہے اور سوائے مشرقی بنگال کے کہ اس کی آبادی پاکستان کی آبادی کے نصف سے قدرے زائد ہے، بیرون بنگال ناقابل فہم ہے، گویا ہر اعتبار سے انڈونیشیا اور پاکستان کی زبان کا مسئلہ قریب قریب ملتا جلتا ہے۔ اب ذرا انڈونیشیا کی دور بینی اور قوت فیصلہ دیکھئے کہ انہوں نے جاوائی اور دیگر تمام زبانوں کو چھوڑ کر سماترا کی ملائی زبان کو بلا شرط استعمال انگریزی، اپنے ملک کی سرکاری زبان بنا لیا۔ ان کا یہ انتخاب بالکل درست اور صحیح ہے، وہ یوں کہ (جس طرح بنگلہ کے مقابلے میں اردو) ملائی زبان سیکڑوں سال سے پورے ملک میں تجارتی طور پر رائج ہونے کی وجہ سے ہر بندرگاہ، ہر جزیرہ اور ہر شہر میں بولی اور لکھی جاتی ہے، اس کے علاوہ اپنے پاس مذہبی اور تمدن کی دولت بھی رکھتی ہے۔

اب 'ملایا' کا فیصلہ ملاحظہ ہو اسکی آبادی بھی کم و بیش پاکستان کے برابر ہے۔ وہاں بھی قریب قریب وہی زبانیں رائج ہیں جو انڈونیشیا میں ہیں۔ لہذا ملایا نے بھی انڈونیشیا

کی طرح 'ملائی' کو اپنی سرکاری زبان منتخب کیا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ دس سال تک سرکاری مراسلت میں انگریزی کا استعمال جاری رہے گا۔ ہر چند کہ ملایا کا یہ فیصلہ انڈونیشیا کے مقابلے میں قدرے محدود ہے تاہم وہ ہمارے پاکستان سے (سابقہ دستور کے مطابق) دس سال پہلے انگریزی شکنجے سے آزاد ہو جائیگا اور شاید ہم کبھی بھی نہ ہوں۔

غور کیجئے! کہاں پاکستان اور کہاں انڈونیشیا اور ملایا؟ کیا ان دونوں ممالک کے روبرو ہماری طرح سیاسی، سماجی، تجارتی، معاشی اور دیگر بین الاقوامی مسائل نہیں ہیں۔ ان دونوں ملکوں نے ہماری طرح ضرورت مند اور قابل امداد ہوتے ہوئے انگریزی کے سامنے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ انڈونیشیا جیسا چھوٹے چھوٹے سیکڑوں جزیرے رکھنے والا ملک جہاں دو چار، دس بیس، بھی نہیں اکٹھی ۲۵۰ زبانیں بولی جاتی ہوں اور ایک جزیرے کا باشندہ دوسرے جزیرے کی زبان نہ سمجھتا ہو، اگر رومن رسم الخط اختیار کر لیتا یا مجبوراً کر لے تو یہ کوئی تعجب اور حیرانی کی بات نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کوئی حکومت بیک وقت ۲۵۰ زبانوں اور رسوم خط کی نگہداشت نہیں کر سکتی۔ ایسے حالات میں رومن رسم الخط کمزور زبانوں کو ختم کر کے یقیناً ایک قومی و سرکاری زبان پیش کرنے کی اصلاحی خدمت انجام دے سکتا ہے، بہر نوع انڈونیشیا اور ملایا کا یہ اقدام قابل تعریف اور لائق تقلید ہے۔

سوائے انڈونیشیا کے کہ جو مشرقی پاکستان سے قریب ہے افغانستان، ایران، ترکی، عراق، فلسطین، حجاز، مصر،

سوڈان، عراق، تمام ممالک اسلامیہ ایک ہی خطے میں واقع ہیں اور یہ سب باہمدگر مذہبی وحدت، جغرافیائی اتصال اور قومی و ثقافتی روایات میں پاکستان سے ہم رشتہ ہیں، بجز ترکی کے کوئی ملک ایسا نہیں جس نے انگریزی کی خاطر اپنی زبان یا رسم الخط کو قربان کر دیا ہو۔ پھر یہ احساس کمتری اور کشکول گدائی ہمارے ہی لئے کیوں مخصوص اور مقدر ہو۔ ہماری زبان اور رسم الخط اتنا گیا گزرا تو نہیں کہ بیرون پاکستان اسے کوئی جاننے اور سمجھنے والا نہ ہو۔ اب تو روس جیسے ملک میں بھی مشرقی زبانوں کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے وہاں لوگ اردو، ہندی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اپنے گھر کو دیکھئے۔ پاکستان کی صنعت و حرفت اور تجارت زیادہ تر، بمبئی، گجرات اور کاٹھیواواڑ کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ لوگ قائداعظم کی آواز پر لبیک نہ کہتے اور اپنا سرمایہ پاکستان میں نہ لگاتے تو یہ ساری دولت ہندوستان ہی کے پاس رہتی۔ ان تاجروں میں گو کثرت سے انگریزی خواندہ نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود تجارت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ پاکستان کی تجارتی ساکھ اور مالیات کا بھرم دراصل انہیں تاجروں کے دم خم سے قائم اور اونچا ہے ان میں سے بیشتر اپنا حساب و کتاب مارواڑی، گجراتی، سندھی اور ہندی میں رکھتے ہیں اسی کے عادی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رکھیں گے۔ دوسرے صوبوں کے تاجروں کی بھی اکثریت اپنے بھی کھاتے اردو میں رکھتے ہیں اور انگریزی

کو زیادہ پسند نہیں کرتی - تجارتی مراسلت انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کرتی ہے - پاکستانی شہروں میں پھرتے تو آپ کو دوکانوں پر آویزاں بورڈ اب انگریزی کی جگہ کثرت سے اردو میں نظر آئیں گے یا انگریزی کے ساتھ اردو بھی شامل ہوگی -

علم معاشیات کی رو سے سکھ جاریہ کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اس شے میں ہو جس کو بطور زر استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اسکو قبول کرنے میں کسی شخص کو انکار کی جرات نہ ہو - دوم یہ کہ وہ اپنی جسامت، شکل، رنگ اور عبارت (جو اس کی قیمت اور حکومت کا نام پیش کرتی ہے) کے لحاظ سے با آسانی شناخت کیا جاسکے تاکہ قبول کرنے والا کوئی دھوکا نہ کھائے - موجودہ نوٹ اور مختلف دھاتوں کے سکے اپنی جگہ خاصے معقول اور دیدہ زیب ہیں - مختصر سی جگہ میں انگریزی کے ساتھ اردو اور بنگلہ میں حکومت کا نام اور قیمت وغیرہ درج ہے اب اگر رومن رسم الخط اختیار کیا گیا تو انگریزی کی جگہ تو وہی سابقہ انگریزی عبارت رہے گی اور دوسری زبانوں میں اردو اور بنگلہ کو رومن رسم الخط میں لایا جائے گا تو کیا یہ صورت مضحکہ خیز نہ ہوگی؟ - اسی طرح ہمارے تولنے کے اوزان، پیمائشی پیمانے، ڈاک، ریل اور بسوں کے ٹکٹ عدالتی اسٹامپ اور بینکوں کے چک وغیرہ کی صورتیں مسخ نہ ہو جائیں گی -

سرکاری دفاتر کا ایک اہم شعبہ ہماری عدالتیں ہیں
 جہاں مقررہ قانون کے مطابق ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا
 جاتا ہے۔ اس قانون کا سرچشمہ بھی کلام الہی ہے، جس کی
 بنیاد پر ہمارا مذہب اسلام قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ مذہب
 کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فقہ اسلامی
 کی مستند کتب، ہدایہ، اور فتاویٰ عالمگیری، وغیرہ ہیں۔
 ہندوؤں میں ”ارتھ شاستر“ کو سند مانا جاتا ہے۔ انگریزوں
 نے اپنا جو ضابطہ دیوانی انگریزی میں مرتب کیا تھا وہ
 انہیں کتب کی روشنی میں کیا گیا تھا لیکن جب یہ نافذ ہوا
 تو تجربے نے انہیں یہ بتایا کہ تنہا انگریزی زبان ہندوستانیوں
 کو قانون نہیں سمجھا سکتی۔ مجبوراً انہیں اسے اردو میں بھی
 منتقل کرنا پڑا۔ حکومت کے ایما پر ترجمہ کا یہ کام
 شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی مرحوم کے سپرد ہوا۔
 انہوں نے تعزیرات ہند، ضابطہ فوجداری، قانون شہادت اور
 انکم ٹیکس کا با محاورہ سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے یہ
 تراجم آج بھی موجود ہیں، جن سے تمام جج، وکلاء اور
 طلباء یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ اگرچہ لاء کالجوں میں ابھی
 تک ذریعہ تعلیم انگریزی ہے لیکن پولیس کے ٹریننگ اسکولوں
 میں جو عملہ پولیس تھانوں اور کچہریوں میں تعینات ہونے
 کے لئے قانونی تعلیم پاتا ہے ان کو ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی
 زبان، اردو ہی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ عوام کے مطالبہ پر اکثر

پاکستانی عدالتوں میں بھی اب اردو کا رواج ہو گیا ہے
گو فیصلے اب بھی انگریزی ہی میں لکھے اور سنائے جاتے
ہیں۔ سمجھو میں نہیں آتا کہ پولیس کے ٹریننگ اسکولوں میں
تو قانون کی تعلیم کے لئے اردو کو بہتر ذریعہ تعلیم سمجھا
جاتا ہے لیکن لاء کالجوں میں اس کی صلاحیت سے دشمنی
برقی جاتی ہے، بہر نوع اردو نے تو اس قانونی باب میں بھی اپنی
قانونی صلاحیت کا ثبوت پیش کر دیا ہے، نیز یہاں ایک بار
پھر یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ زبان اور رسم الخط اپنا ایک
مذہب رکھتے ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ قانونی کتب انگریزی زبان
میں ہونے کے باوجود اپنے مضامین کی کثرت، طوالت، ضخامت،
وزن اور قیمت میں کافی مشہور ہیں۔ اگر اس بحر ذخار
کو پولیس کے میٹرک اور نان میٹرک طلباء کے لئے رومن
رسم الخط میں منتقل کیا گیا تو پھر یہ بالکل ناقابل عبور
ہو جائے گا۔ مقدمات کی مثلیں، فیصلے اور آن کی نقول پہلے
سے بھی زائد اوراق پر قلمبند ہوں گی۔

ان براہین اور نظائر کی موجودگی میں یہ تصور کرنا
اور یہ باور کرانا کہ سرکاری اور نجی دفتری کاروبار میں
رومن رسم الخط کی وجہ سے ہم آہنگی، توازن اور سہولت
پیدا ہو جائے گی یا انگریزی کے زور اور شدت میں کمی آجائے گی
ایک دور از کار بات ہے۔

فشر و اشاعت

ہے دل کے لئے سوت مشینوں کی حکومت
احساس سروت کو کچل دیتے ہیں آلات
اقبال رح

اس متمدن اور ترقی یافتہ دور میں وقت کی قیمت اور
قدر و منزلت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بلا پس و پیش اور
بغیر اندیشہ و بیم انسان کا ہر قدم وقت کی رفتار کے ساتھ
آٹھتا ہے، ساری دنیا وقت کے ہمراہ بڑی تیزی اور سرعت کے
ساتھ دوڑ رہی ہے۔ اس ارتقا کا محرک وہ علم سائنس ہے جس
نے قدرت کے پیدا کردہ تمام مادوں، ذرائع اور وسائل کو
انسان کی ملکیت اور حاکمیت میں دے دیا ہے۔ سائنس کی
بدولت اس عالم ایجادات میں ایسی محیر العقول چیزیں وجود
میں آچکی ہیں، اور آ رہی ہیں کہ اب فلسفہٴ حیات و حیات
کسی تشریح کا محتاج نہیں رہا :

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب

سوت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اخلاقی اعتبار سے انسان کی زندگی پر سائنس اپنا پرتو
کس طرح ڈالتا ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں،
یہ عیب و صواب اس وقت ہمارا موضوع مباحث نہیں، البتہ

اقتصادی اور معاشی نقطہ نظر سے سائینس کے نتائج کا تعمیری اور نتیجہ خیز ہونا شبہ سے بالاتر ہے۔ دیگر ترقیات سے قطع نظر سائینس نے اپنی کرشمہ گری سے دنیا کی زبانوں اور ان کے علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں معقول حصہ لیا ہے۔ ابتدا میں خط و رقم کے وسائل کیا تھے، ان تحریروں اور کتبات کے تحفظ اور نشر و اشاعت کا ذریعہ کیا تھا اور آج ان کا انداز اور معیار کیا ہے؟ آج قدیم تحریری طوالت ”شارٹ ہینڈ“ کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے، قلم کے نقوش ٹائب رائٹر کے حسین اور رفتار کے سامنے بالکل ساند ہیں۔ کاٹھ کے قدیم دقیانوسی پریس اس زمانہ کی جدید روٹری مشینوں کے مقابلے میں بالکل بیکار اور حقیر نظر آتے ہیں۔

طباعت کا کام دو طرح سے ہوتا ہے۔ اول ”لیتھو“، دوم ”لیٹر پریس“۔ لیتھو میں پتھر یا زنک پلیٹ استعمال ہوتی ہے اور لیٹر پریس میں ”سکے“ کے ٹائب یا ”اسٹریو“ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں جہاں تک تصاویر وغیرہ کا تعلق ہے وہ لیتھو میں ”ونڈائٹک“، یا دوسرے طریقوں سے پلیٹ پر اتار کر چھاپی جاتی ہیں اور لیٹر پریس میں بلاک سے کام لیا جاتا ہے۔

مروجہ لیتھو کی طباعت کا آغاز زرد رنگے ہوئے کاغذ پر ایک خاص روشنائی کے ذریعہ کتابت سے ہوتا ہے۔ یہ روشنائی کچی ہوتی ہے، اس لئے کتابت کی غلطیاں آسانی سے درست ہو جاتی ہیں۔ کتابت کے بعد کاپی کو پتھر یا زنک پلیٹ پر جما کر دستی پریس کی مدد سے پہلے پروف اٹھایا جاتا

ہے تاکہ کتابت یا پروف میں جو غلطیاں یا نقائص نظر آئیں انہیں طباعت سے قبل پتھر یا پلیٹ ہی پر درست کر دیا جائے، بعد ازاں پتھر کو یونہی مشین پر جما دیا جاتا ہے اور اگر پلیٹ ہے تو اسے سلنڈر پر کس دیتے ہیں۔ اس پتھر یا پلیٹ پر کیمیائی سیاہی کے رولر دوڑتے ہیں، ان رولروں اور پتھر یا پلیٹ کے درمیان کاغذ دباؤ میں آ کر حروف کے نقوش حاصل کر لیتا ہے، پھر یکے بعد دیگرے یہ کاغذ چھپ چھپ کر ایک پرزے کے ذریعہ مشین کی دوسری طرف یا تو خود بخود جمع ہوتے جاتے ہیں یا ایک آدمی انہیں اٹھا اٹھا کر باقاعدہ رکھتا جاتا ہے۔ تصاویر کی طباعت کے لئے لائن بلاک کے چربوں سے کاپی تیار کی جاتی ہے۔

لیتھو کی یہی طباعت یورپ اور امریکہ میں نئے انداز سے ہوتی ہے۔ مثلاً امریکہ نے پلیٹ پر کاپی کا عکس اتارنے کے لئے ونڈائک کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اس کی کتابت باریک کاغذ پر سیاہ روشنائی سے ہوتی ہے۔ انگلستان میں اس کام کے لئے لیتھو آفسٹ ہے جس میں تحریر ہو یا تصویر وہ ہو بہو کاغذ پر چھپ جاتی ہے۔ کاپی پر تحریر یا تصویر کا رنگ جس قدر شوخ اور چمک دار ہوگا۔ اسی قدر چھپائی میں اس کا روپ آئے گا۔ یہ آفسٹ مشین بیک وقت دو تین رنگ بھی چھاپ سکتی ہے۔ آفسٹ سسٹم میں کاپی کی تحریر ہر داب میں اول ربر کی ایک چادر پر منتقل ہوتی ہے۔ اس چادر کے آٹھے حروف کاغذ پر چھپتے وقت سیدھے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے الٹی کتابت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ الغرض باریک اور

رنگین کام کے لئے یہ آفسٹ مشین نہایت ہی مفید اور کار آمد ہے مگر یہ مشین اور اس کے کارکن دونوں بڑی قیمت پر حاصل ہوتے ہیں۔

لیٹر پریس کی طباعت لیتھو کی چھپائی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی چھپائی کی ابتدا ٹائپ کمپوزنگ (حرف پردازی) سے ہوتی ہے جو چھوٹے اور بڑے، باریک اور موٹے اور مختلف وضع و قطع کے ہوتے ہیں اور یہ سب فاؤنڈری میں ڈھلتے ہیں۔ کمپوزیٹر (حرف پرداز) ان حروف کو لکڑی کے خانوں میں سے نکال نکال کر اول اپنی ”اسٹک“ میں بھرتا ہے پھر ان اسٹکوں سے صفحہ کتاب، اخبار یا رسالہ کے سائز کے مطابق ”گیلی“ تیار ہو کر پروف ریڈر کے پاس پہنچ جاتی ہے وہ اس گیلی کی اغلاط درست کرنے کے بعد مشین مین کے حوالہ کر دیتا ہے۔ مشین مین اسے ”چیسس یا لاک اپ“ میں کس کر فرمہ کی شکل میں چھپائی کے لئے مشین پر چڑھا دیتا ہے۔

کمپوزنگ کے جدید ترین طریقوں میں ”لائنو ٹائپ، مانو ٹائپ اور انٹر ٹائپ“ کی برق رفتار مشینیں ایجاد ہوئی ہیں جو فی الحقیقت نہایت کار آمد اور مفید ہوتی ہیں، ادھر آپ نے کچھ فرمایا، ادھر اسٹینو گرافر نے اسے شارٹ ہینڈ میں لکھ کر ٹائپ کیا اور چھپنے کیلئے ”آپریشن“ کے پاس پریس میں بھیج دیا۔ آپریشن کے سامنے ٹائپ رائٹر کی قسم کی ایک مشین ہوتی ہے جس کا ”کی بورڈ“، ٹائپ رائٹر ہی کی طرح کا ہوتا ہے۔ ان دونوں کی بورڈوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ معمولی ٹائپ رائٹر میں بورڈ کے مطلوبہ حروف انگلیاں مارنے

سے اٹھ جاتے ہیں اور اپنے ساتھ ربن کو لیتے ہوئے کاغذ پر آن حروف کو چھاپ دیتے ہیں۔ کمپوزنگ کی مشینوں میں بھی بورڈ پر انگلیاں مارنے سے حروف خود بخود حرکت میں آتے ہیں۔ ایک طرف انگیٹھی میں سکھ پگھلتا رہتا ہے، دوسری طرف سے یہ حروف اپنی سیگزین سے نکل کر سیال سکھ میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ اس طرح لائنو اور انٹر ٹائپ میں یکے بعد دیگرے پوری سطر ایک ساتھ ڈھلتی رہتی ہے، اگر ٹائپ کرتے وقت ایک حرف بھی غلط ہو جائے تو پوری سطر از سر نو ڈھالی جاتی ہے۔ اس کے برعکس مانو ٹائپ میں ہر حرف الگ الگ ڈھل کر گرتا ہے۔ الغرض یہ سطر میں اس طرح ڈھلتی رہتی ہیں، ایک دوسرا پرزہ ان سطور کی گیلی بناتا جاتا ہے۔ اس گیلی سے مطلوبہ سائز کا صفحہ مرتب ہوتا ہے۔ پورا فرمہ تیار ہونے کے بعد اگر ”فلیٹ بیڈ روٹری“ ہے تو اس میں رکھ دیا جاتا ہے اور بجلی کی سرعت کے ساتھ چھپائی شروع ہو جاتی ہے، اخباری کاغذ کی ایک چکی ہوتی ہے جو مشین پر چڑھی رہتی ہے، اس چکی کا کاغذ مشین کے اندر ہی اندر چھپتا، کٹتا اور طے ہو کر باہر نکلتا رہتا ہے۔ اگر ”سلنڈر روٹری“ ہے تو چھاپنے سے پہلے دو تین کام اور انجام دینے پڑتے ہیں اور وہ یہ کہ اول پورے فرمے پر ایک موٹا کارڈ بورڈ قسم کا کاغذ رکھ کر اسے دبایا جاتا ہے۔ اس داب سے تحریر یا تصویر کا ایک کافی گہرا نقش کارڈ بورڈ پر آ جاتا ہے۔ اس کاغذ کو ایک سلنڈر پر چڑھا کر اس کا اسٹریو لیتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ سکھ کا ڈھلا ہوا پورا فرمہ ایک

مدور شکل اختیار کر لیتا ہے جو چھاپنے کے لئے روٹری کے سلنڈر پر جڑ دیا جاتا ہے بعد ازاں حسب قاعدہ مذکور چھپائی مکمل ہو جاتی ہے۔

فن طباعت اسقدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ یہ مختصر سا مقالہ اور اس کا یہ ضمنی عنوان اس سے زیادہ تفصیل کا مستحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر مزید شرح بھی کی جائے تو جب تک ذاتی مشاہدہ اور عملی تجربہ نہ ہو طباعت کا کام سمجھ میں آنا محال ہے۔ چونکہ اس فن سے ہم خود برائے نام آشنا ہیں لہذا ہم نے بھی انجمن ترقی اردو پاکستان کی شائع کردہ کتاب ”فن صحافت“، مصنفہ چودھری رحم علی المہاشمی مطبوعہ ۱۹۰۳ء سے قدیم و جدید فن طباعت کا یہ مختصر سا خاکہ بصورت اقتباس پیش کیا ہے تاکہ ہم اپنے مباحث پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔

مدعا یہ ہے کہ دنیا فن طباعت میں ترقی کرتے کرتے آج کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے لیکن اردو نستعلیق کے گلے میں لیتھو کا جو پھندا اول روز طباعت پڑا تھا وہ جوں کا توں موجود ہے بمشکل تمام ایک مدت دراز کے بعد ترقی کی جانب صرف ایک قدم یہ اٹھا ہے کہ وزنی پتھروں کی جگہ ہلکی پھلکی زنک پلیٹوں نے لے لی ہے اور عام لیتھو مشینوں کی بجائے نام نہاد لیتھو روٹری میں چھپائی ہونے لگی ہے جس کے نتیجہ میں چھپائی نسبتاً تیز اور کاپیاں پہلے سے زیادہ تعداد میں حاصل ہوتی ہیں۔ یہی صورت پرانے لیٹر پریس کی چھپائی کی ہے جس کی دیر طلب اور تکلیف دہ کمپوزنگ کو ہم ایک مدت سے بھگتتے چلے آ رہے ہیں۔

فی زمانہ معیاری کتابیں ، بالخصوص وہ اخبارات اور رسائل زیادہ پسندیدہ اور مقبول ہوتے ہیں جو مصور ہوں ۔ جدید مذاق کا تقاضا یہ ہے کہ متعلقہ تصاویر ، مضامین یا خبروں کے ساتھ ہی ساتھ شائع ہوں لیتھو میں ایسا ہونا ناممکن تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہے ۔ اس مقصد کے لئے لائن بلاک کے چربوں سے کام لیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ عمل محض آنسو پونچھنے کے مترادف ہے کیونکہ کثیر اشاعت ہونے کی صورت میں یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوتی ہے ۔ مجبوراً تصاویر کو حسب ضرورت لائن یا ہاف ٹون بلاکس میں علیحدہ علیحدہ چھاپنا پڑتا ہے ۔ لیٹر پریس میں دشواری پیش نہیں آتی ۔

لہذا اب اگر ہمیں اپنی زبان و رسم الخط کا فروغ مقصود ہے اور اپنے ادب کو مختلف علوم و فنون سے مالا مال کرنا ہے تو نہ صرف خط نستعلیق کی ، قدیم دقیانوسی طرز طباعت ” لیتھو “ سے ، گلو خلاصی کرانی پڑے گی بلکہ جلد یا بدیر پرانے لیٹر پریس کو بھی خیر باد کہنا ہوگا ۔ ان دونوں کی بجائے جدید آفسٹ ، لائنو ، مانو اور انٹر ٹائپ کمپوزنگ طباعت کو رواج دینا پڑے گا ۔ نظر برائیں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس جدید طرز طباعت میں خط نستعلیق سے کس حد تک کنارہ کشی ممکن ہے اور نستعلیق ٹائپ کی کامیابی کا کہاں تک امکان ہے اور یہ کامیابی ہمیں کتنی مدت میں نصیب ہوگی ؟

نستعلیق کا ماخذ تعلیق ہے، تعلیق کا موجد حسن بن حسین بن علی فارسی ہے جسے اُس نے ۷۰۰ھ (عہد شاہان دیالمہ) میں خط نسخ، رقاع اور ثلث کے لطیف امتزاج سے ایجاد کیا تھا۔ یہ ترچھے حروف میں لکھا جاتا تھا۔ خط نسخ ابن مقلہ کی اختراع ہے جسے اُس نے اپنے ایجاد کردہ خطوط کوفی جدید اور معقلی سے ۳۱۰ھ بہ زمانہ القاهر باللہ عباسی رائج کیا تھا۔ پھر ۳۸۳ھ میں اسے ابو الحسن علی ہلال (معروف بہ ابن بواب) نے مرصع اور مہذب کیا۔

نستعلیق کا اصل موجد کون تھا؟ یہ اگرچہ هنوز تحقیق طلب ہے تاہم بعض مورخین اس کا موجد امیر علی تبریزی اور بعض یاقوت متعصمی کو ٹھیراتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اول الذکر نے خط نستعلیق کی تحریر کے قواعد منضبط کئے اور ۹۰۹ھ میں رسم الخط پر ایک مبسوط رسالہ لکھا جو اس وقت برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ امیر علی نے ۹۵۰ھ میں یا ۹۵۷ھ کے بعد وفات پائی۔ اس لحاظ سے موجودہ خط نستعلیق کی عمر تقریباً ۶۰۰ اور خط نسخ کی ۱۰۶۸ سال ہے اور چونکہ یہ دونوں خطوط ارامی یا سامی الاصل ہیں لہذا کم و بیش ۶ ہزار برس پرانے ہیں۔ نسخ اور نستعلیق کے درمیان جو معمولی سا فرق ہے وہ بھی ذہن نشین کر لیجئے :

نسخ کا ہر دائرہ شروع سے آخر تک یکساں ہوتا ہے اور حرفوں میں کسی قدر ناہمواری پائی جاتی ہے یعنی دائرے گول ہونے کی بجائے اپنا نچلا حصہ چپٹا رکھتے ہیں

جس کی وجہ سے آن میں زاوئیے پیدا ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس نستعلیق میں نقاشی اور مصورانہ شان اور بانگپن ہے۔ اس کے حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصہ باریک ہوتا ہے اور دائرے خوشنما اور مدور ہوتے ہیں تلفظ کی صحت کے لئے اعراب ثلاثہ (زیر، زبر، پیش) اور جزم، تشدید اور تنوین نیز حروف منقوطہ میں امتیازی نقاط جن کو ابن مقلہ نے صحت کے بعد ایجاد کیا تھا نستعلیق کو اور بھی حسین بنا دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نستعلیق اعلیٰ کتابی خط کہلاتا ہے اور نسخ خالص عربی یا قرآنی۔ اس جزوی فرق کے باوجود کاتب اور قاری دونوں کے لئے ان خطوط کا لکھنا اور پڑھنا نہایت سہل اور آسان ہے۔

جہاں تک نستعلیق ٹائپ کا تعلق ہے بلاشبہ نستعلیقی حروف نسخی حروف کی بہ نسبت فنی اعتبار سے ٹائپ کی وضع اختیار کرنے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن ایران، مصر، شام اور عراق نے فنی تقاضوں کے ماتحت نسخ میں اضافہ کر کے اپنا ٹائپ، ٹیلی پرنٹر اور پریس کی تمام ضروریات کو پورا کر لیا ہے۔ ان تمام ممالک میں لائٹو ٹائپ اور روٹریاں بکثرت استعمال ہو رہی ہیں۔ دراصل ماضی کی غلامی، حکومتوں کی عدم سرپرستی، اور عوام کی رسمی اصلاحات کے باعث اردو نستعلیق ابھی تک نسخ کی طرح اتنا مکلف اور مہذب نہیں ہوا ہے اسی لئے موجودہ چند دشواریاں ٹائپ وضع کرنے میں پیش آتی ہیں مثلاً :-

(۱) نستعلیق کی خوشنمائی کا دار و مدار نوگ پلگ اور حروف کی نشست و برخاست پر ہے، یہ باتیں ٹائپ میں پیدا ہونی دشوار ہیں۔

(۲) نشست کے التزام کے لئے اگر ٹائپ میں ایسے حروف بنائے جائیں جو ایک دوسرے پر چڑھائے جا سکیں تو وہ ذرا سی ٹھیس پا کر ٹوٹ جائیں گے اور بعض مواقع پر بیکار ثابت ہوں گے، نیز کتابت کے اصول سے نشست الفاظ غلط اور بھدی ہو جائے گی۔

(۳) جلی ٹائپ میں جوڑوں کے لئے جو خط اختیار کیا جائے گا وہ باریک ٹائپ میں غائب ہو جائے گا یعنی ضرورت کے مطابق چھوٹا باریک ٹائپ بننا دشوار ہے۔

(۴) حروف اور جوڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، کمپوزیٹر کو کمپوز کرتے وقت سخت دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ نیز کمپوزنگ میں وقت کی تاخیر تجارتی لحاظ سے بھی نقصان دہ ہے۔

(۵) نقاط، زیر، زبر، پیش، جزم، تشدید اور تنوین کی علامات کو بھی ٹائپ میں لانا ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ مذکورہ بالا جن مشکلات کو ہم نے پیش کیا ہے ان پر قابو پانا کس حد تک اور کتنی مدت میں ممکن ہوگا اس کا صحیح جواب تو صرف ماہرین فن ہی دے سکتے ہیں، تاہم گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں اردو ٹائپ کے لئے جو سرکاری اور نیم سرکاری کوششیں کی گئیں ہیں بالخصوص سرکار نظام دکن

نے اردو ٹائپ میں جو اصلاح و ترقی پیش کی ہے اس کو دیکھ کر یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس پر حکومت اور عوام یک جہتی کے ساتھ صحیح معنوں میں متوجہ ہوں تو چار پانچ برس ہی میں موجودہ مشکلات رفع ہو سکتی ہیں اور پھر ہم اپنے اصلاح یافتہ نئے نستعلیق خط کو لائٹو ٹائپ اور جدید روٹریوں میں بے دھڑک استعمال کر سکتے ہیں، ہماری صحافت اور جملہ علوم و فنون وہی بلکہ اس سے بھی بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں جو اس وقت متمدن ممالک کو حاصل ہے۔

یہ تجویز اور خاکہ تو مستقبل کے لئے ہے فی الوقت سوال یہ ہے کہ موجودہ صحافت، علوم و فنون اور نجی و سرکاری مراسلات کی تحریروں میں، جو متمدن دنیا کی ترقی کی آئینہ دار اور قوی نظریات کی نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہیں، تیزگامی کیونکر پیدا کی جائے اور وہ رتبہ کیسے حاصل کیا جائے جو یورپ اور امریکہ کو حاصل ہے۔ اس نیک اور عظیم مقصد کے لئے ہمیں تھوڑا سا ماضی قریب کی طرف لوٹنا ہوگا۔ یقین کیجئے کہ ہماری یہ عارضی پسپائی کوئی رجعت پسندی نہیں ہوگی بلکہ ایک ایسا دانشمندانہ اقدام ہوگا کہ ہم اپنی اس اصل راہ کو پائیں گے جو ہمیں ہماری منزل مقصود پر پہنچانے والی تھی۔ اس راہ کو ہم نے اول اپنی دوراندیشی سے اختیار کیا تھا لیکن بعد میں مغربیت کے اقتدار سے مرعوب اور محکوم ہو کر اسے چھوڑ بیٹھے۔ یہ راہ مستقیم وہی شاہراہ خط نسخ ہے جسے

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی کے بعد سر سید اعظم، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی مرحوم نے اختیار کیا تھا جو فن صحافت اور سیاست کے مسلمہ امام تھے۔ بلاشبہ ان عظیم شخصیتوں نے انتہائی دوراندیشی سے کام لے کر ہمیں ایک روشنی دکھائی تھی۔ سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی کا آرگن، جو بعد میں ”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ“ کے نام سے مشہور ہوا اسی نسخہ ٹائپ میں شائع ہوا تھا۔ سر سید کی تقلید میں مولانا ابوالکلام نے اپنا ہفتہ وار ”الہلال“ اور بعد میں شائع ہونے والے تمام پرچے اسی نسخہ ٹائپ میں شائع کئے تھے، الہلال پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں میں تباہ ہو گیا۔ مولانا محمد علی مرحوم نے بھی اپنا مشہور اور مقبول اخبار ”ہمدرد“ نہایت آب و تاب سے اسی نسخہ ٹائپ میں نکال کر یہ واضح پیشن گوئی کی تھی کہ اگر اردو ادب اور صحافت کو ترقی کے میدان میں گامزن ہونا ہے تو اس کے لئے صرف یہی ایک راستہ ہے، لیکن کیا کیا جائے یہ ہماری حماقت اور بد اعمالی تھی کہ ہم نے ان آئمہ سلت کی آواز کو لبیک کہنے کی بجائے صدا بہ صحرا کر دیا اور اس خط اور لکیر پر نہیں چلے جو ہمیں آسمان شہرت پر لیجانے والی تھی۔ ذرا غور تو کیجئے کہ جس نسخہ ٹائپ کو ہم نے ابتدا میں اختیار کیا تھا اگر اسے بدستور اپنائے رکھتے تو آج ایران، مصر، شام و عراق کی طرح ہم بھی ادب، صحافت اور تجارت میں پیش پیش نظر آتے۔ لیکن خیر اب بھی معاملہ اپنے ہاتھ میں ہے۔ اپنی گذشتہ

بربادیوں پر آنسو بہانے کی بجائے ہمیں ہمت و استقلال اور پوری توجہ و انہماک کے ساتھ سرگرم عمل ہونا چاہیئے۔ ہم ہزار سست رفتار اور پس ماندہ سہمی لیکن خدا نہ کرے کہ ہم احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج بھی ہمیں بہتوں سے افضلیت و برتری حاصل ہے اور ہمارا ہر قدم اصلاح اور ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

اردو زبان کے لئے نسخ ٹائپ کوئی نئی چیز نہیں۔ قدیم اور جدید علوم و فنون کی لاکھوں کتابیں اور اخبارات و رسائل ہمارے مطالعہ میں آچکے اور آرہے ہیں۔ ہماری سب سے عظیم و مقدس کتاب کلامِ الہی اسی خط نسخ میں ہے جسے ہم حسب توفیق روزانہ پڑھتے ہیں، روزانہ لکھتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ کم و بیش بولتے بھی ہیں۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار ہمارے اس دعوے کا بین ثبوت ہیں۔ واضح ہو کہ سندھی، پشتو، بلوچی اور عربی زبان (جنکا رسم الخط عربی نسخ ہے) بولنے والوں کی تعداد ۹۰ لاکھ ۸۹ ہزار ۹۰۰ ہے، ان میں ۳۱ ہزار ۲۱۸ ہمارے مشرقی پاکستان کے بنگالی بھائی ہیں اور ۲۳ ہزار ۸۲۵ مغربی پاکستان کے برادران ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بھائی بنگلہ زبان اور دیوناگری رسم الخط کے ہزار شیدائی سہمی پھر بھی عربی نوشت و خواند کے لحاظ سے ان کی تعداد مغربی پاکستان سے تقریباً پچاس فیصدی زیادہ ہے۔ ”انجمن حروف القرآن“ کی مساعی اور مشرقی پاکستان کی اسلام پسندی اس تعداد میں روز بروز اضافہ کر رہی ہے۔ یہ اضافہ اس بات کی دلیل ہے

کہ مشرقی پاکستان آہستہ آہستہ دیوناگری رسم الخط کو چھوڑ کر اپنے قدیم آبائی ساسی خط سے ماخوذ نسخ اور نستعلیق کی جانب بہ رضا و رغبت رجوع ہو رہا ہے۔ بالفرض مجال اگر مشرقی پاکستان کے مسلمان اس طرف راغب نہ بھی ہوں تو ان کے لئے پھر بھی یہ بات قطعاً مجال ہے کہ وہ اپنے دیوناگری رسم الخط کو جسے وہاں کی عام اکثریت ایک مدت سے اپنائے ہوئے ہے اور اس میں انہیں ٹائپ اور پریس کی تمام سہولتیں حاصل ہیں، بیٹھے بٹھائے، خواہ مخواہ، رومن رسم الخط کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور از سر نو اپنی بنگلہ کی الف، بے، تے رومن رسم الخط میں شروع کریں جو اپنی جگہ صحیح معنوں میں نہ بنگلہ ہوگی اور نہ ہی رومن۔

اس کے برعکس پنجابی، اردو اور فارسی جن کا رسم الخط اردو نستعلیق ہے بولنے والوں کی تعداد ۲ کروڑ ۱۷ لاکھ ۱۳ ہزار ۲۲۱ ہے۔ یہ عربی نسخ کے فدائی اور اردو نستعلیق کے شیدائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ان سے یہ کہا جائے گا کہ تم فی الحال نستعلیق چھوڑ دو اور نسخ ٹائپ کو استعمال کرو تو ان کو نقل کی بجائے اصل شے حاصل کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا اور جب یہ نقل بہ منزلہ اصل ہو جائے گی تو ان کو دو گونہ خوشی و مسرت حاصل ہوگی۔ باقی رہے عاشقان انگریزی و لاطینی جن کی تعداد صرف ۱۳ لاکھ ہے، یہ انکی دور اندیشی اور پیش بینی ہوگی کہ وہ ہمارے ہم نوا اور ہم مشرب ہو جائیں یا اپنی آسی ٹیٹری لکیر پر چلیں اور گٹ پٹ جاری رکھیں۔

مختصر یہ کہ خط نسخ سے یہ جو تھوڑی سی اجنبیت اور غیر مانوسیت ہمارا اردو داں اور غیر اردو داں طبقہ محسوس کرتا ہے جب نسخ ٹائپ کا عام رواج ہو جائے گا، تمام کتابیں، اخبارات و رسائل اور سرکاری و نجی مراسلت، ایک ہی خط اور ٹائپ میں ہونے لگے گی اور لوگ اپنے نفع و نقصان کو عملی شکل میں دیکھیں گے تو انکی موجودہ غیریت، نا آشنائی، وقتی رقابت اور تعصب جاتا رہے گا۔

واضح رہے کہ اس پیشکش سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے چھ سو برس کے محبوب خط نستعلیق سے عربی نسخ کی خاطر بالکل دست بردار ہو جائیں یقیناً اس میں چند خامیاں ہیں لیکن ان چند خامیوں کے مقابلے میں اس میں حسن و جمال اور دیگر ایسی بہت سی خوبیاں ہیں جنہیں ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے، اس لئے ایک محدود پیمانے پر صرف اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ اردو نستعلیق اور لیتھو روٹری میں جاری رہے۔ اخبارات کے نام اور ان کے مستقل عنوانات نستعلیق خط کے بلاک بنا کر نسخ ٹائپ کے ساتھ استعمال ہوتے رہیں، دیگر کثیر الاشاعت چیزیں بھی نسخ ٹائپ ہی میں شائع ہوں، دوسری جانب نستعلیق رسم الخط کو زیادہ سے زیادہ آسان اور کامیاب نستعلیق ٹائپ کی صورت میں لانے کے لئے سرکاری اور عوامی کوششوں کا آغاز کیا جائے تاکہ نشر و اشاعت کے وہ تمام وسائل اور ذرائع ہمیں حاصل ہو جائیں جن سے اس وقت یورپ اور امریکہ متمتع ہو رہا ہے اس کام سے عہدہ برا ہوتے ہی ہم

بلا ٹوقف نسخ ٹائپ کی جگہ اپنے اصلاح یافتہ نستعلیق ٹائپ
کو رائج کر دیں گے۔ اس دوران میں انگریزی کی بجائے اردو
کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور ابتدائے تعلیم ہی سے نسخ
رسم الخط کی مشق کرائی جائے۔ اردو ٹائپ رائٹر اور اردو
مختصر نویسی ہمارے لئے اب کوئی نئی چیز نہیں رہی پھر
بھی ہائر سکندری اسکولوں میں اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ
کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس کام کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد
میں ٹائپ رائٹر درآمد کئے جائیں۔ ہماری تمام صوبائی
حکومتیں اپنے اضلاع میں اردو میں، اور مرکز سے انگریزی میں
مراسلت کریں، اس مقصد کے لئے آن ۲۱ ہزار سے زائد دفتری
اصطلاحات کو جن کا مستند اردو ترجمہ نیز متعدد ضابطوں کے
مجموعے اور سرکاری مراسلت کے نمونے حکومت کی مقرر کردہ
مجلس زبان، اردو میں منتقل کر چکی ہے کام میں لائے
جائیں۔ صرف مرکز ایک وقت مناسب تک بیرون پاکستان
اپنے مخصوص سیاسی مسائل اور تجارتی امور کے لئے بدستور
انگریزی میں مراسلت کرتا رہے۔

جہاں تک ہماری اردو نستعلیق کی اصلاحی کوششوں
کا تعلق ہے آن میں پہلے سے زیادہ تیزی اور سرگرمی پیدا
ہونی چاہیئے، ہمارے سابق و یر تعلیمات مسٹر فضل الرحمن
کے عہد وزارت میں تعلیمی اصلاحات اور رسم الخط اور ٹائپ
کے مسئلہ پر غور و خوض ہوا تھا، اس مشاورتی مجلس میں
پاکستان کے مشہور خطاط عبدالمجید کو بھی طلب کیا گیا
تھا۔ مجید صاحب نے ان مدبروں کی رائے کے مطابق

فن خطاطی کی روشنی میں اردو ٹائپ کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا
تھا جسے عربی نسخ اور اردو نستعلیق کی ایک درمیانی شکل
کہا جاسکتا ہے۔ ٹائپ کا یہ نمونہ . . . ڈکڑوں پر مشتمل
ہے۔ اس وقت یہ نمونہ پسند کیا گیا، اور اسکی تکمیل کے لئے
عملی قدم بھی اٹھایا گیا چنانچہ اس سجزوہ اردو ٹائپ کے خاکے
پر لائٹو کمپوزنگ مشین تیار ہوئی۔ یہ مشین اس وقت
ہمارے گورنمنٹ پرنٹنگ پریس میں موجود ہے۔ معجید صاحب
کی اطلاع کے مطابق اسی قسم کی دوسری مشین یا مشینیں
مشہور سیفی اینڈ کمپنی، ویسٹ وہارف، کراچی کے پاس بھی
بغرض فروخت موجود ہیں۔ واضح رہے کہ اس نستعلیق ٹائپ کے
مقابلے میں مصری نسخ ٹائپ میں صرف ۲۲ جوڑے ہیں۔
ظاہر ہے کہ یہ جوڑے جسقدر کم ہوں گے اسی قدر ٹائپ رائٹر
اور لائٹو ٹائپ کمپوزنگ میں آسانی اور سہولت ہوگی۔

صرف ٹائپ وضع کرنے کی غرض ہی سے نہیں بلکہ
ناخواندہ یا خواندہ طلبہ کو اردو پڑھانے اور لکھانے کے لئے
بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے مرکب الفاظ جو کئی
حروف پر مشتمل ہوں ان کو توڑ کر ڈکڑوں میں لکھا جائے
مثلاً:

صوبہ جات کی بجائے

صوبہ جات

دستخط کی بجائے

دست خط

فارغ التحصیل کی بجائے

فارغ آل تحصیل

اسی طرح اعراب میں تشدید کو متعلقہ حرف کی مکرر املا یا تکرار سے دور کیا جاسکتا ہے مثلاً :

بطخ کی بجائے بططخ یا بططخ
کلو کی بجائے کللو

علامت تنوین کو بھی معمولی سی ترمیم کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں مثلاً :

حکماً کی بجائے حکمن
نسلاً کی بجائے نسلن

حروف شمسی اور قمری کو ٹکڑوں میں لکھ کر ان کے لام کی آواز کو مخفی اور روشن رکھا جاسکتا ہے کیپٹل لیٹر (حرف کبیر) کے سلسلہ میں بھی اردو پر اعتراض کیا جاتا ہے، جواباً عرض ہے کہ اول تو حرف کبیر کے متعلق ہمارے ہاں یہ قاعدہ موجود ہے کہ خاص نام و مقام لکھنے کے بعد اس لفظ کے اوپر عرض میں ایک سیدھا خط کھینچ کر اس کو واضح کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نیا پیرا شروع کرتے وقت اس سطر کا پہلا لفظ قدرے حاشیہ چھوڑ کر لکھتے ہیں اور اگر فقرہ درمیان ہی میں ختم ہو جاتا ہے تو وہاں نقطہ یا ڈیش (-) دے کر مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں مصر کے سابق شاہ فواد نے ۱۹۳۲ء سے کچھ عرصہ قبل ”حروف تاج“ کے نام سے ”حروف کبیرہ“ رائج کئے تھے جو شاید آج بھی وہاں مستعمل ہیں۔ ہم نے ان حروف کبیرہ کا نمونہ ۱۹۵۴ء میں رسالہ معارف، اعظم گڑھ، میں

دیکھا تھا۔ ہمارے خیال میں ان حروف میں کافی گنجملک اور طوالت ہے اور ٹائپ کے لئے غیر موزوں ہیں۔

اس ترقی یافتہ زمانے میں زبان اور ادب کی نشر و اشاعت کا ذریعہ تنہا ٹائپ اور طباعت ہی نہیں ہے بلکہ ریڈیو، فلم، نیوز سروس (ٹیلی پرنٹر) بری و بحری تار وغیرہ بھی ہیں۔ ٹائپ اور طباعت کے مسئلہ پر تو ہم ابھی ابھی کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ طباعت کا ذریعہ گو مستقل اور دیر پا ہے لیکن یہ اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب طباعت کے تمام مراحل بحسن و خوبی پورے ہو جائیں اور ڈاک کا عملہ بری، بحری اور فضائی مواصلات سے کام لے کر مطبوعہ لٹریچر کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جائے۔ لیکن ریڈیو بیک وقت ایک ہی لمحہ میں ہماری زبان اور ہمارا پیام دنیا کے گوشے گوشے میں ہر سننے والے متنفس کو روزانہ اور مسلسل پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح نیوز سروس، تار اور ٹیلی پرنٹر کے ذریعہ ایک سلک کی خبریں دوسرے ممالک میں بھیج سکتی ہیں۔ خاموش اور ناطق فلموں میں حصہ لینے والے اداکاروں کا کردار بھی اس باب میں نہایت موثر اور معنی خیز حیثیت رکھتا ہے۔ پروپیگنڈے کے ان تمام وسائل میں زبان اور رسم الخط کا سوال پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ریڈیو میں خبروں کا سعلن، فیچرز، تقاریر، کہانیوں اور ڈراموں میں حصہ لینے والے اداکار اپنی زبان کو اپنے رسم الخط میں پڑھ کر جس روانی اور صحت کے ساتھ بول سکتے ہیں وہ رومن رسم الخط میں ناممکن ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے پروگرام آن کی علمی کم مائیگی کی وجہ سے مسخ ہو جائیں گے۔

ان دونوں کے مقابلے میں بچوں کا تعلیمی پروگرام تو قطعاً مفقود ہو جائے گا۔ اس لئے کہ یہ کمسن بچے گھنٹے دو گھنٹے کی روزانہ مشق کرنے کے بعد ساتویں دن کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ریڈیو آرٹسٹ کی نگرانی میں اپنا کردار ادا کریں۔ ادنیٰ و اعلیٰ پرائمری جماعتوں کے یہ ننھے ننھے طلباء رومن رسم الخط میں اپنا ریڈیو کا سبق کیونکر پڑھ سکیں گے؟

بھارت اور پاکستان کے ریڈیو کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بھارت اردو کو نظر انداز کر کے ہندی اور سنسکرت کے مغلق اور سنگلاخ الفاظ میں اپنے ملک کی خبریں اور پروگرام پیش کرتا ہے، اس کے برعکس پاکستان ریڈیو کی زبان نہایت آسان اور قابل فہم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں بھارتی ریڈیو کو عوام بہت ہی کم سنتے ہیں اور پاکستان ریڈیو کی آواز بھارت کے طول و عرض میں روزانہ جا بجا گونجتی ہے۔ رومن رسم الخط اس صوتی طلسم کو بالکل پاش پاش کر دے گا۔ فی الحقیقت ریڈیو صرف آواز، زبان، تلفظ اور لب و لہجے کا کھیل ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

نیوز سروس والے اپنے خریدار اخباری اداروں کو ضروری خبریں بھیجنے کے پابند ہیں۔ اخباری عملے کے اکثر ایڈیٹر دن رات ان خبروں کا ترجمہ کرنے اور کاتبوں کو اردو میں لکھ لکھ کر دینے میں مشغول رہتے ہیں۔ اگر یہی خبریں تار اور ٹیلی پرنٹر کے ذریعہ اردو میں موصول ہوں تو ایڈیٹر ان پر اپنی ایک ہی نظر انتخاب ڈال کر کاتب کے حوالہ کر سکتا ہے اس طرح

خبروں کے کالموں میں کافی وسعت پیدا ہو سکتی ہے اور قارئین تک یہ خبریں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پہنچ سکتی ہیں۔ نجی اور کاروباری آردو تار بھی اسی اعتبار سے ترجمہ کی زحمت کے بغیر آسانی سے نشر اور وصول کئے جاسکتے ہیں۔

خاموش فلموں کا دور ختم ہو گیا۔ جس زمانے میں ان کی نمائش ہوتی تھی تو درمیان میں بار بار ڈرامے کی کہانی کا خلاصہ اور اداکاروں کے مکالمے انگریزی زبان میں پردہ سیمین پر پیش کئے جاتے تھے لیکن انگریزی داں حضرات انگریزی سے واقف ہوتے ہوئے بھی مقررہ وقفہ میں وہ تمام عبارت نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ناطق فلموں میں بھی فلم کے متعلق ضروری معلومات تحریری صورت میں پیش کی جاتی ہیں، اسٹیج اور فلم کے اداکاروں کو اپنے متعلقہ رول کے مکالمات پڑھ کر از بر کرنے پڑتے ہیں، ان بڑے بڑے رولز کا حفظ کرنا اصل اداکاری سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اگر رومن رسم الخط جاری کیا گیا تو فلم جیسی نفع بخش صنعت اور پروپیگنڈے کا یہ موثر ذریعہ بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو جائے گا۔

الغرض ہم یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ رومن رسم الخط میں ٹائپ اور طباعت کی بہت سی آسانیاں موجود ہیں اور یہ کہ وہ بہت ترقی یافتہ بھی ہے لیکن ہم اسے اپنانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ سوال صرف آسانیوں ہی کا تو نہیں بلکہ اس کا مقصد عظیم بھی ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔

موجودہ اُردو ٹائپ رومن ٹائپ کے مقابلے میں اتنا ناکارہ نہیں ہے کہ ہم اُسے اختیار نہ کر سکیں۔ اردو رسم الخط میں اصلاحات کی جاچکی ہیں، اور آئندہ بھی کی جاسکتی ہیں۔ ایڈیٹر جنگ، کراچی کے بقول رومن رسم الخط اختیار کر لینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جس انگریزی زبان کو ہم اپنے ملک سے جلد یا بدیر ختم کرنا چاہتے ہیں اس کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کے سلسلہ میں سب سے بڑا اور فیصلہ کن قدم اٹھالیا جائے گا اور وہ ان کہی کہہ لی جائے گی جس سے بچنے کے لئے یہ قوم شروع سے کوشاں ہے۔

حرف آخر

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زبان تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
اقبال رح

مشرق کا مشہور مقولہ ہے کہ نصب العین تک
پہنچنے کے لئے تین راستے ہیں۔ تقلید کا راستہ، غور و فکر کی
راہ اور عمل و تجربے کی شاہراہ۔ اس مقولہ کی روشنی میں فیصلہ
کیجئے کہ ہمارے لئے کون سی راہ بہتر ہے؟

کورانہ تقلید مسلمان کا شیوہ نہیں، اس کی فطرت میں
اجتہاد ہے، غور و فکر کا پتلا ہے اور عمل و ایجاد کا بندہ !
وہ پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ روایات کہن کو ٹھکرائے
اور نئی روایات کو قائم کرے۔ اس کے قائم کردہ نقوش
دوسروں کے کام آئیں۔ اس کی راہ مستقیم یہی متوازی دوراہہ
ہے، ” غور و فکر کی راہ اور عمل و تجربے کی شاہراہ، “
راہ عبارت ہے، زندگی اور حرکت سے، حرکت میں
ہمیشہ برکت ہے۔ راہی یقین محکم اور عمل پیہم رکھتا ہے۔
قدم قدم پر منزل پاتا ہے، منزل بہ منزل بڑھتا ہے اور
منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

ہماری حکومت کے تمام محکموں، سماج کے تمام طبقوں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے۔ موجودہ حکومت اس ضرورت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہے، مارشل لاء جاری ہونے کے بعد، ہر محکمے، ہر طبقے اور ہر شعبے کی چھان بین اور اس میں ترمیم و اصلاح ہو رہی ہے۔ چنانچہ حکومت کا مقرر کردہ تعلیمی کمیشن ہمارے تعلیمی نظام کا مفصل جائزہ لے رہا ہے اس ضمن میں اس کے روبرو مسئلہ 'رسم الخط بھی زیر غور ہے۔ اس کی اہمیت اور نوعیت، ارکان کمیشن پر بخوبی روشن ہے کیونکہ قومی ترقی کا انحصار، زبان اور اس کے ذریعہ رسم الخط پر ہے۔ بقول جسٹس کے رحمان، 'کوئی قوم کسی غیر زبان کو اپنا کر اپنی خودی کو قائم نہیں رکھ سکتی، یہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ دل کی بات اپنی ہی زبان میں کہی جاسکتی ہے۔ دماغی صلاحیتیں بھی افکار اور تخلیقی فکر سے اسی وقت ہم آہنگ ہوتی ہیں جب ذریعہ تعلیم اپنی زبان ہو،'۔

تعلیمی کمیشن مقرر ہونے کے بعد جب رسم الخط کے بارے میں کمیشن کی جانب سے عوامی نقطہ نظر طلب کیا گیا تو ملک کے تمام اخبارات نے لیڈنگ آرٹیکلز لکھ کر اپنا اظہار خیال کیا۔ روز نامہ 'جنگ'، کراچی نے اس میں یہ اضافہ اور کیا کہ ایک باقاعدہ استصواب رائے کے ذریعے ملک کی رائے عامہ کو حکومت کے سامنے پیش کیا جو ۹۹ فیصد سے بھی زائد اردو رسم الخط کے حق میں تھی۔

جنوری ۱۹۵۹ء میں اردو کے ادباء اور شعراء کا ایک عظیم اجتماع کراچی میں ہوا جس کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ اہل قلم کے درمیان یک جہتی اور ہم آہنگی کے جذبے کی تخلیق ہو اور اسلامی نظریہٴ حیات اور تعمیر وطن کے باب میں ان کی مشترکہ اور اجتماعی کوششیں بار آور ہوں۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۵۹ء میں ”مغربی پاکستان اردو کانفرنس“، لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس میں مغربی پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیمی و عامی اداروں کے مندوبین نے شرکت کی۔ مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ تمام بھی خواہان اردو نے ایک جگہ جمع ہو کر زبان و ادب سے متعلق تمام مسائل پر غور و فکر کیا۔ اس کانفرنس میں جو قرار دادیں پاس ہوئی ہیں بلا شبہ وہ نہایت ہی وزنی، ٹھوس اور صحت مندانہ ہیں۔

اس باب میں ہم نے بھی اپنی محدود قابلیت اور بساط کے مطابق جو کچھ ہم سے بن پڑا، انتہائی جذبہٴ خلوص اور آزادی رائے کے ساتھ بے دھڑک پیش کر دیا ہے۔ آغاز سے اب تک اردو زبان اور رسم الخط کی یہ داستان غم آپ کے روبرو ہے۔ ایک فرد قوم ہونے کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ ہم بھی انہیں قومی نظریات اور مطالبات کے حامی اور علم بردار ہیں جو ”مغربی پاکستان اردو کانفرنس“، لاہور کی قرار دادوں کی صورت میں ہمارے سامنے آئے ہیں، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس مقالے میں مختلف عنوانات کے ماتحت مختصر طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے کہیں زائد

کانفرنس میں، باہائے اردو کے علاوہ، کانفرنس کے صدر استقبالیہ اور فاضل مندوبین نے اپنی تقاریر میں علی الاعلان کہہ دیا ہے، نیز ہمارے قومی معروضے پر پاکستان کے اہل فکر و نظر نے پہلے ہی اپنا صناد کردیا ہے، وہ معروضہ یہ ہے :

(۱) رسم الخط : اردو کے مروجہ رسم الخط

”نستعلیق“ کو مناسب ترمیم و اصلاح کے بعد برقرار رکھا جائے۔ اصلاح و ترقی کی غرض سے حکومت اپنی اولین فرصت میں ماہرین السنہ، فن خطاطی اور فن طباعت پر مشتمل ایک سرکاری کمیشن مقرر کرے جس کا دائرہ کار صرف مروجہ خط نستعلیق میں مناسب ترمیم، تنسیخ اور ایضاد ہو۔ یہ کمیشن ایک وقت معینہ میں اس مسئلہء رسم الخط پر ہر زاویے اور نقطہء نگاہ سے انتہائی غور و فکر کے بعد حصول مقصد کے لئے اپنی جو مفید اور کارآمد سفارشات پیش کرے اس کا خاکہ ان خطوط پر ہو :

(الف) ہمارے سرکاری اور نجی دفاتر کو اصلاح یافتہ

نستعلیقی حروف کے جدید اردو ٹائپ رائٹرز حاصل ہوں۔

(ب) نیوز سروس میں اسی منظور شدہ نستعلیقی حروف کے

ٹیلی پرنٹرز میں اخباری اداروں کو تمام خبروں کی

تحریر و ترسیل کریں۔

(ج) طباعت کے لئے ”لائنو، مانو اور انٹر ٹائپ

کمپوزنگ“ کی جدید برق رفتار مشینوں میں مجوزہ

نستعلیق ٹائپ بلا تکلف استعمال ہو۔

(د) اس عبوری دور میں عارضی طور پر عربی خط نسخ اور ٹائپ کو فی الفور رائج کیا جائے جس میں ٹائپ رائٹرز، ٹیلی پرنٹرز، لائٹنو، مانو اور انٹر ٹائپ کمپوزنگ طباعت کی تمام سہولتیں اور آسانیاں موجود ہیں۔ اس وقت ایران، مصر، عراق اور شام وغیرہ تمام اسلامی ممالک میں نہایت کامیابی کے ساتھ رائج ہے۔ پاکستان کی مسلم اکثریت کے لئے بھی یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ دینی مقاصد کے پیش نظر اس سے مزید آشنائی اور قربت انتہائی ضروری ہے۔

ہمارے قدیم علوم و فنون کا گمشدہ سرمایہ اور جدید علمی و فنی ذخائر کی ایک اچھی خاصی دولت اسی خط کے دامن میں موجود ہے۔

مغربی پاکستان کی تمام علاقائی زبانیں اس سے ذہنی اور روحانی قربت رکھتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کو بھی عربی رسم الخط سے محبت ہے۔ اس کے مزید رواج سے ہماری باہمی یگانگت اور اخوت کے احساس کو مزید تقویت پہنچے گی۔

پاکستان اور ممالک اسلامیہ کے درمیان ایک عالمگیر ہم آہنگی، ہم خیالی اور یک جہتی کی راہیں استوار ہوں گی اور اس طرح ہم ان سے اور زیادہ قریب ہو جائیں گے۔

(ہ) نسخ ٹائپ کو عارضی طور پر رواج دینے کے لئے تمام مدارس میں، پرائمری سے اعلیٰ جماعتوں تک

فی الفور رائج کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے جملہ درسی کتابیں نسخ ٹائپ میں شائع کی جائیں تاکہ خواندہ افراد کی اکثریت اور زیر تعلیم طلبہ کو اس ٹائپ سے کوئی اجنبیت باقی نہ رہے اور آنے والی نسل اپنا تمام تر کاروبار ٹائپ میں انجام دے سکے۔

(۲) اتحاد السنہ پاکستان : علاقائی اور

صوبائی زبانوں کا باہمی اختلاط و ارتباط، ملک کی وحدت اور سالمیت کے علاوہ قومی تہذیب اور علمی ترقی کا ضامن اور آئینہ دار ہوتا ہے، لہذا مغربی اور مشرقی پاکستان کے مختلف مراکز میں ہمہ زبان ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس ضمن میں ایسے ادارے قائم کئے جائیں جس میں تقابلی ادب کی تحریک کو تراجم اور تالیفات کی صورت میں تقویت دی جائے۔

(۳) اردو نیوز سروس اور قار : مغربی پاکستان

میں اردو اخبارات کی اشاعت انگریزی اخبارات سے کہیں زائد ہے لیکن خبر رسائی کا تمام کام انگریزی میں ہوتا ہے ایسی صورت میں اردو اخبارات کو ترجمے کی زحمت کے علاوہ دیگر متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس وجہ سے اردو صحافت کا معیار بلند نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ایسے چند ہی آزاد ممالک ہوں گے جہاں خبروں کی تحریر و ترسیل کا کام آن کی

قومی زبان میں نہ ہوتا ہو لہذا وقت کی اس اہم ضرورت کے پیش نظر نہ صرف اردو نیوز سروس کا قیام عمل میں لایا جائے بلکہ اردو میں تار دینے کی جو سہولت اس وقت صرف چند شہروں میں ہے اُسے دوسرے شہروں میں بھی عام کیا جائے۔

(۴) تعلیم اور ذریعہٴ تعلیم : مغربی پاکستان میں اردو کو ذریعہٴ تعلیم قرار دیا جائے :

(الف) اردو کو آرٹس و سائنس کے مضامین کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لئے بلا تاخیر ایک پنج سالہ منصوبہ بنا کر آس کا نفاذ ۱۹۶۳ء کے تعلیمی سال سے کیا جائے انگریزی کے بعد بھی ایک مناسب مدت تک طب ٹیکنالوجی اور اعلیٰ تر مدارج میں سائنس کی تعلیم کے لئے اردو برقرار رکھی جائے۔

(ب) سائنس اور ریاضی کی تعلیم میں بین الاقوامی مصطلحات و علامات رائج الوقت کو اردو میں بلا تکلف استعمال کیا جائے۔ اسی طرح بین الاقوامی عددی نظام سے بھی جب تک ضروری ہو برابر کام لیں۔

(ج) مغربی پاکستان میں اردو کی لازمی تعلیم پرائمری سے ہائر سکینڈری تک جاری کی جائے۔ اگر کسی علاقے میں مقامی ضرورت کے پیش نظر پرائمری کے درجے تک مقامی زبان میں تعلیم دینی ضروری ہو تو حتیٰ الوسع اُسے اختیار کیا جائے، جو طلباء ہائر سکینڈری

کے بعد اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند ہوں ان کے لئے انگریزی تعلیم لازمی نہ ہو۔

(د) درجہ ششم سے ہائر سکندری تک عام علمی شوق کے ماتحت انگریزی کی تعلیم کا آغاز بذریعہ اردو نہایت معقول پیمانے پر کیا جائے جو اس وقت نہیں ہے تاکہ طلباء میں نہ صرف انگریزی کی ادبی قابلیت پیدا ہو بلکہ وہ بجا طور پر اس میں اپنا مافی الضمیر ادا کر سکیں۔

(ہ) مغربی پاکستان کی تمام یونیورسٹیاں فوری طور پر اردو کو ہر درجے میں امتحانی زبان تسلیم کریں اور تمام الحاق کرنے والی جامعات ہر اردو کالج کا الحاق منظور کریں۔

(و) اردو دارالترجمہ قائم کیا جائے اس کے ماتحت مختلف اداروں میں جملہ علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ اس کے علاوہ اردو میں اصطلاحات کی ایک سوزوں فرہنگ، ایک مبسوط اردو لغت ایک بڑی انگریزی اردو ڈکشنری اور ایک جامع قاموس نیز دیگر ضروری کتب حوالہ کی ترتیب و تدوین کا کام بہت جلد شروع کیا جائے۔

(ز) اردو کی تمام درسی کتابیں ٹائپ میں چھاپی جائیں، اس کام کے لئے ضروری مشینری درآمد کی جائے۔

(ح) اردو ٹائپ اور اردو شارٹ ہینڈ کی تعلیم اور سندیں دینے کا تعلیمی اداروں میں سرکاری پیمانے پر انتظام کیا جائے۔

(۵) دفاتر کی زبان : (الف) مغربی پاکستان میں فوری طور پر اردو کو دفتری زبان کی حیثیت دی جائے اور جب تک مرکز کی زبان انگریزی ہے اس وقت تک مرکز اور صوبے کے درمیان تمام مراسلت انگریزی میں ہو۔

(ب) ضلعی دفاتر میں اردو کو واحد سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور سکریٹریٹ میں سرکاری نوٹ اردو میں لکھے جائیں۔

(ج) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی اعلیٰ ملازمتوں کے لئے جو امتحانات لئے جائیں ان میں اردو کو بھی اظہار خیال کا ذریعہ تسلیم کیا جائے۔

(د) اردو ٹائپ رائٹرز کی معقول تعداد سرکاری و نجی دفاتر کے لئے مہیا کی جائے۔

(۵) سرکاری لسانی کمیٹی، جن اصطلاحات، ضابطوں کے مجموعے اور سرکاری مراسلت کے نمونے اردو میں منتقل کر چکی ہے انہیں سرکاری دفاتر میں رائج کیا جائے اور حسب ضرورت ان میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔

اب قائد اعظم رح اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے الفاظ میں ہمارا یہ حرف آخر بھی سن لیجئے کہ :

” پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی اور جو کوئی اس بارے میں غلط فہمی پھیلانا چاہتا ہے وہ صریحاً پاکستان کا دشمن ہے۔“

(تقریر ڈھاکہ، قائد اعظم رح)

” جو لوگ اپنی قومی زبان کے استعمال سے شرماتے ہیں ان کو قومی غیریت کا احساس نہیں ہے، وہ قائد اعظم کی توہین کرتے ہیں، وہ اپنے اسلاف کی اور خاص کر ان بزرگوں کی توہین کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مادری، ذہنی، اخلاقی، روحانی مساعی سے اس زبان کو عروج تک پہنچایا، وہ ساری قوم کی توہین کرتے ہیں۔“

(خطبہ صدارت اردو کانفرنس، لاہور۔ ڈاکٹر عبدالحق)

قائد اعظم کی دورانہدیشی، سیاسی بصیرت اور اصابت رائے کا کون قائل نہیں؟ بابائے اردو کی ان تھک مساعی اور عظیم الشان خدمات اردو سے کون منحرف ہو سکتا ہے؟ یاد رکھئے ہم ”لشکری“، سپاہی ہیں اور اردو ہمارا ناقابل تسخیر قلعہ ہے۔ ہم ”بانگ درا“، اور ”ضرب کلیم“ رکھتے ہیں۔ ہمارے جیتنے جی اس قلعہ اردو پر ”رومن“، دشمن کا پھیرا نہیں لہرا سکتا۔ ہمارا نعرہ ہے —

” اردو بولو، اردو لکھو، اردو پڑھو۔“

اردو زبان زندہ باد

پاکستان پائندہ باد



اشاریہ

انتساب

حرف ناشر

حرف راقم : ۴

خطاطی : ۷

تخلیق زبان : ۸

تاریخ السنہ اقوام : ۱۲

عربی خطوط : ۲۶

ایرانی و ترکی خطوط : ۳۸

دولت مغلیہ میں علم الخط کی ترقی : ۴۸

گذشتہ لکھنؤ : ۶۴

دور حاضر : ۶۹

دیگر ممالک میں رسم الخط : ۸۱

ہمارا رسم الخط : ۶۷

پاکستان کے بنیادی نظریات : ۹۹

مذہبی روایات : ۱۰۵

تعلیمی مسائل : ۱۱۵

ثقافتی اقدار : ۱۳۲

صوبجاتی اور بین القومی اتحاد : ۱۴۶

دفتری نظم و نسق اور کاروباری تقاضے : ۱۵۳

نشر و اشاعت : ۱۶۵

حرف آخر : ۱۸۷